ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن
ٹکراؤ
محمد محی الدین

ٹکراؤ

روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) میں شائع ہونے والا مقبول ترین ناول

محمد محی الدین

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون 37352332-37232336

نام کتاب	....	ٹکراؤ
مصنف	....	محمد محی الدین
ناشر	....	گل فراز احمد (علم و عرفان پبلشرز، لاہور)
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	....	محمد زاہد ملک
کمپوزنگ	....	انیس احمد
تعداد	....	1100
سن اشاعت	....	اگست 2012ء
قیمت	....	=/300 روپے

...... ملنے کے پتے ......

ویلکم بک پورٹ	خزینہ علم و ادب
اُردو بازار، کراچی	الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی	کتاب گھر
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی
کلاسیک بکس بوہڑ گیٹ، ملتان	کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال
رائل بک کمپنی	مکتبہ رشیدیہ
فضل داد پلازہ، کمیٹی چوک راولپنڈی	جنرل مارکیٹ، چکوال۔ فون 0301-5785262

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرماویں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

پیر مغاں

شکیل عادل زادہ

کے نام

پیش لفظ

خدائے لم یزل کا بے پایاں احسان کہ اس نے ہمیں اس لائق کیا، کہ ہمارے قلم کی روشنائی سے تشکیل پانے والے الفاظ و تراکیب پہلے پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار کے میگزین کے ذریعے لاکھوں قارئین تک پہنچے اور اب یہ کتابی شکل میں شائع ہونے جا رہے ہیں۔

پہنچ کے در پہ تیرے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں، جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم روایتی اعتبار سے ادبیات کے طالب علم نہیں رہے، اس لیے "ناول" کے بنیادی لوازمات سے رسمی طور پر آگاہ نہیں ہیں۔ مستزاد یہ کہ ہم نے موضوع بھی منتخب کیا تو

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

ہمارے ہاں یہ فرض کیا جا چکا ہے کہ ناول کا موضوع یا رومان ہوگا یا مار دھاڑ سے بھرپور جاسوسی کہانی ہوگی حالانکہ تفریح طبع کے ساتھ یہ ابلاغ کا بھی بہترین ذریعہ ہے، جس کے ذریعے مصنف اپنی فکر اپنا زاویہ نظر قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

عالمی ادب میں ناول کے موضوعات میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے، روایتی جاسوسی اور رومانوی موضوعات کے علاوہ ناول، معلومات، شعور اور آگاہی کا بہترین ذریعہ اظہار ہے، اس کی مثال جوسٹین گارڈر کا مشہور ناول "سوفی کی دنیا" ہے جس میں مصنف نے فلسفیانہ سوچ کے عہد بہ عہد ارتقاء کو موضوع بنا کر اس پر بحث کی ہے۔

ہمارا بھی بنیادی ارادہ تو یہی ہے کہ اردو میں بھی اس روایت کو فروغ دیا جائے۔

اب تیرا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں!

ہم نے اپنی فہم کے مطابق، جو کچھ ہو سکتا تھا، پیش کر دیا ہے، اگر آپ کو یہ کاوش پسند آتی ہے تو یہ سلسلہ آگے جاری رہے گا ورنہ

بجھے چراغوں میں کتنے ہیں جو جلے ہی نہیں
سو او وقت انہیں جگمگانا چاہیے تھا

آخر میں ہم ان تمام کرم فرماؤں کے شکر گزار ہیں، جن کے پیہم اصرار کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں تھی۔ ان میں سرفہرست نرجس ملک ہیں، ان کے علاوہ دیگر بہت سے احباب ہیں، ہم محترم گل فرآز صاحب کے بھی مشکور ہیں، جو اس ناول کو کتابی شکل میں شائع کرنے لگے ہیں۔

یوسفِ شعر کو، کس مصر میں لائے ہو فرآز
ذوق آشفتہ نوائی، نہیں دیتا، کچھ بھی

محمد محی الدین

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجیے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

''اسامہ کی موت ''امن'' کی فتح ہے۔

انسانیت کی فتح ہے۔

تہذیب وتمدن کی فتح ہے''۔

رابرٹ بڑے جوش وخروش سے بول رہا تھا: میں جیسے ہی کینٹین میں داخل ہوا تو اس نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے آخری جملہ نسبتاً بلند آواز میں ادا کیا۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی نینسی کی نظر بھی اس دوران مجھ پر پڑ چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی تحقیر تھی۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ان کی ٹیبل پر موجود دیگر افراد نے بھی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر خود پر قابو پایا اور پھر ان کی میز کی طرف بڑھ گیا۔

''امن' انسانیت اور تہذیب وتمدن کی فتح مبارک ہو'' میں نے پرجوش آواز میں اپنی باچھوں کو پوری طرح پھیلاتے ہوئے انہیں مخاطب کیا: ''اور ہاں سی آئی اے کی بھی'' میرا آخری جملہ سن کر ان کے ہونٹوں پر آئی مسکان کو یکدم بریک لگ گئی۔

''کیا مطلب؟'' رابرٹ کا انداز تیکھا تھا۔

''میرا مطلب صاف ہے۔ اسامہ کی موت 'امن' انسانیت' تہذیب وتمدن کے ساتھ' ساتھ سی آئی اے کی بھی عظیم فتح ہے'' میرا انداز بھی چبھتا ہوا تھا۔

''تم مسلمان ہو اور ہر مسلمان انتہا پسند ہوتا ہے'' رابرٹ نے شانے اچکاتے ہوئے کہا ''مجھے اس بات پر حیرت نہیں ہے کہ تم اسامہ کی موت پر برہم ہو'' اب کے نینسی نے بھی گفتگو میں دخل دیا ''اسامہ کی موت پر، اپنے ہم مذہب، بلکہ اپنے قائد کی موت پر، اسلام کے عظیم مجاہد کی موت پر'' اس کا انداز آگ لگا دینے والا تھا۔ لیکن بچپن ہی سے ابا کے ہاتھوں مار کھانے کے دوران اپنے غصے پر قابو پانے کی جو تربیت قدرت نے کی تھی وہ آج کام آ رہی تھی۔ اس لیے میں نے پھر سے مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا: ''تم نے ٹھیک کہا' اسلام کے عظیم مجاہد اور سی آئی اے کے پرانے دوست کی موت پر میں بہت برہم' بہت افسردہ اور غمگین ہوں''

میری اس بات پر رابرٹ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے اور اس کا غصہ اپنی جگہ ٹھیک تھا' کیونکہ ایک عام آدمی کے نزدیک اسامہ ایک دہشت گرد تھا' اور ''سی آئی اے کا دوست'' کہنے کا مطلب یہ ہے' آپ یہ کہیں کہ امریکی حکومت اس کی پشت پناہی کر رہی تھی' اور کوئی عام امریکی یہ نہیں سوچ سکتا کہ امریکی حکومت یا کوئی امریکی ریاستی ادارہ دہشت گردی کا پشت پناہ ہو سکتا ہے' لیکن دوسری طرف یہ بات بھی حقیقت تھی کہ جن لوگوں کو بدنام زمانہ تنظیم القاعدہ کے ستون سمجھا جاتا ہے' ان سب کو میدانِ جہاد تک کھینچ کے لانے کا سہرا

سی آئی اے کے سر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ امریکی حکومت نے اپنے مفاد کے تحت بعد میں مجاہدین سے لاتعلقی اختیار کی۔ لیکن اس کے باوجود بعض حلقوں میں یہ خدشات اب تک موجود ہیں کہ القاعدہ اور اس جیسی دیگر تنظیموں کو سی آئی اے کی سرپرستی میں چلایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تنظیموں کی ہر کارروائی کا فائدہ بنیادی طور پر امریکیوں کو ہوتا ہے جیسے القاعدہ کی مہربانی اور طالبان کی اسلام پسندی کی وجہ سے امریکی افواج اس وقت افغانستان میں موجود ہیں اور یہ کیسی حیران کن بات ہے کہ وہ طالبان جو مہذب دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھے وہ طالبان اپنے کمانڈر امیر المومنین ملا عمر سمیت پسِ منظر میں چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ بن لادن' ایمن الظواہری اور القاعدہ نے لے لی ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں میڈیا اتنا فاسٹ ہو چکا ہے کہ چند دن پہلے کا واقعہ بھی ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام امریکی کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا کہ یہی اسامہ اور القاعدہ جنہیں آج امن کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب سی آئی اے کے تیار کردہ مہرے ہیں' میں نے جب یہی حقیقت رابرٹ کے سامنے بیان کی تو وہ شدید غصے میں آ گیا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ویٹر کو اشارے سے اپنے پاس بلایا' وہ پاس آیا تو میں نے اسے اپنے لیے اورنج جوس لانے کا آرڈر دیا' ویٹر سے فارغ ہو کر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف توجہ کی' تو ان کے اعصاب پر موجود تناؤ کی کیفیت ان کے چہروں سے ظاہر تھی' میں نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں کہا: ''ایک منٹ! ذرا ٹھنڈے ہو جاؤ!'' میں نے چند لمحے انتظار کیا' لیکن ان کا ہیجان کم ہوتا ہوا محسوس نہیں ہوا' مجھے سمجھ نہیں آئی کہ میں کیسے ان لوگوں کو اپنی بات سننے کے لیے تیار کروں' بے بس ہو کے میں نے اپنی آنکھیں بند کیں' بے چینی کے عالم میں بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اس کے ساتھ ہی آنکھیں کھول کے بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھا' تو ریستوران کے کونے میں مجھے ''ڈورتھی'' ایک نوجوان لڑکی کے پاس سے اُٹھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ راہبہ کے مخصوص لباس میں تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پولینڈ کے کسی چرچ میں راہبہ کے طور پر مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کی خدمت سرانجام دے رہی ہے اور آج کل نفسیات سے متعلق کوئی کورس کرنے کے لیے یہاں آئی ہوئی ہے۔ کسی باقاعدہ ارادے کے بغیر میں کرسی پیچھے کرتے ہوئے کھڑا ہوا اور میزوں کے درمیان میں سے گزرتا ہوا ''ڈورتھی'' کی طرف بڑھا' جو کیفے ٹیریا کے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اسے آواز دی: ''معاف کیجیے گا'' اس نے رک کر آہستگی سے پلٹ کر میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا' میں نے پہلی مرتبہ اس کو اتنے قریب سے دیکھا تھا اور یہ پہلا چہرہ تھا جو میں نے اس یونیورسٹی میں سرمہ و غازہ کے بغیر دیکھا تھا' اس کے چہرے پر پاکیزگی' تقدس اور معصومیت تھی۔ میں اس کے صبیح چہرے کے نقوش سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ اسے بھی عورتوں کی فطرت کے عین مطابق ایک لمحے میں اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس کا مقابل کسی جذباتی لمحے کی گرفت میں ہے۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی لکیر اُبھر کر فوراً غائب ہو گئی۔

کسی کے سامنے ناگواری کے اظہار سے گریز' شاید اس کے مذہبی منصب کا بنیادی تقاضا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بدستور

سوالیہ تھا' میں نے خود کو سرزنش کی اور عاجزانہ لہجے میں بولا: ''کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت عنایت کرنے کی مہربانی کریں گی'' مردوں کے لہجے کی عاجزی عورتوں کی انا کو تسکین دیتی ہے' میں اس بات سے واقف تھا۔ ''ڈورتھی'' اگرچہ راہبہ تھی مگر ایک عورت ہی تھی۔ ''میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں'' اس کی آواز بھی اس کی شخصیت کی طرح دل کش تھی۔ یوں جیسے گھنٹیاں بجتی ہوں لفظوں کے کلیساؤں میں ''مجھے آپ ابھی تھوڑا سا وقت عنایت کرسکتی ہیں؟'' میں نے جان بوجھ کر ادبی انگریزی کا سہارا لیا۔ کیونکہ امریکی تعلیمی اداروں میں بھی روایتی ادبی انگریزی شرافت و نجابت کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہے۔

''مجھے کیا کرنا ہے؟'' آس پاس بیٹھے ہوئے کچھ لوگ اب ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے' کیونکہ ڈورتھی کے راہبہ ہونے اور میرے مسلمان ہونے سے بہت سے افراد واقف تھے۔ اور مجھے احساس ہوا کہ رابرٹ اور اس کے ساتھی تو مسلسل مجھے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوں گے۔

صورتحال ایسی ہی نہیں تھی کہ کوئی دیکھنے والا اس غلط فہمی کا شکار ہوتا کہ میں اس سے ''تم سب یسوع مسیح کی بھیڑیں ہو'' کا سبق لینا چاہ رہا تھا' اپنی جذباتیت کی وجہ سے شاید میں غلطی کا مرتب ہوا تھا' میں نے ان سب خیالات کو جھٹک کر اسے مخاطب کیا۔

''آیئے! میں آپ کو اپنے دوستوں سے ملواتا ہوں'' میں نے ہاتھ کے اشارے کے ذریعے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی ٹیبل کی طرف رہنمائی کی۔ ٹیبل کے پاس پہنچ کر میں نے آگے بڑھ کر اس کے لیے کرسی سرکائی' وہ بیٹھ گئی۔ تو میں بھی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہماری ٹیبل اور آس پاس موجود ٹیبلوں پر موجود افراد اب کچھ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر کھڑے ہو کر آس پاس موجود افراد پر نظر دوڑاتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا: ''دوستو! ہم یہاں ایک ڈسکشن کا آغاز کرنے لگے ہیں' اگر آپ میں سے کوئی ہمیں جوائن کرنا چاہے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی'' ڈورتھی نے اُلجھے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے آنکھوں کے ذریعے اسے متحمل رہنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ کی ٹیبلوں سے چھ افراد اُٹھ کر اپنی کرسیاں کھینچ کر ہمارے قریب ہو گئے اور بقیہ سر جھٹک کر اپنی دلچسپی کی چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے ویٹر کو اشارے کے ذریعے پاس بلا کر کرسیوں اور ٹیبل کو نئی ترتیب سے رکھنے کی ہدایت کی اور خود بھی اُٹھ کر اسکی مدد کرنے لگا۔ حاضرین' جن کی مجموعی تعداد میرے اور ڈورتھی سمیت 13 ہو چکی تھی۔ سب نے اپنی اپنی کرسیاں اُٹھا کر نئی ترتیب سے رکھ لیں۔ اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے بعد سب میری طرف دیکھنے لگے۔ ''ہم میں سے بعض افراد کی طرح میں بھی امریکی نہیں ہوں'' میں نے اپنی تمہید کے آغاز میں مشترکہ نکات کو اُجاگر کرنا شروع کیا۔ ''آپ کی طرح میں بھی یہاں علم کی روشنی حاصل کرنے آیا ہوں'' سب لوگ مکمل طور پر میری طرف متوجہ تھے۔ ''میڈیکل سائنس کے اعتبار سے میں بھی بنی نوع انسان کا ایک فرد ہوں۔ فزکس' کیمسٹری اور بائیالوجی کے وہ تمام قاعدے قانون میرے جسم پر اسی طرح لاگو

ہوتے ہیں، جس طرح آپ لوگوں پر ہوتے ہیں''۔

''صرف میڈیکل سائنس کے؟'' نینسی نے طنزیہ انداز میں دریافت کیا تو اس کے گروپ کے ساتھی ہنس پڑے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ ان کا ہیجان کم ہو اور وہ پُرسکون کیفیت میں آ جائیں۔

''یہ میری بدقسمتی ہے کہ صرف میڈیکل سائنس مجھے انسان تسلیم کرتی ہے'' میرے ہونٹوں پر بھی اب طنزیہ مسکراہٹ آ چکی تھی۔ جس کا ہلکا سا اثر لہجے میں بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''ارے بھئی! ہم تو تمہیں آج تک انسان ہی سمجھتے آئے تھے تو کیا تم کوئی اور مخلوق ہو؟'' رابرٹ نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا تو ڈورتھی کے علاوہ سب لوگ ہنس پڑے' ڈورتھی کے چہرے پر مسکان بھی نہیں رینگی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ایک غیر معمولی سمجھدار لڑکی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم آج تک مجھے انسان سمجھتے آئے ہو'' میں نے رابرٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا: ''لیکن میرا مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ جس وجود کو میڈیکل سائنس انسان کہتی ہے۔ امریکیوں کی سوشل سائنس انہیں تین طرح کی مخلوق میں تقسیم کرتی ہے: امریکی' نان امریکی اور مسلمان''۔

پستہ قامت یانگ نے میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''تم نے بالکل ٹھیک تجزیہ کیا ہے'' وہ چینی نژاد تھا اور اس کا چچا چینیوں کے خلاف فسادات میں مارا گیا تھا۔

''اگر امریکن اتنے ہی بُرے ہیں تو تم لوگ امریکہ چھوڑ کے چلے کیوں نہیں جاتے؟'' نینسی نے ناگواری سے ناک چڑھاتے ہوئے کہا' تو میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی یانگ نے اسے جواب دیا: ''امریکہ تمہارے باپ دادا کی سرزمین نہیں ہے' یہ ریڈ انڈین کا خطہ ہے' تو تم لوگ بھی امریکہ چھوڑ کے اپنے آبائی ملک واپس چلے جاؤ!'' یانگ کے لہجے میں اشتعال تھا۔ اس کا جواب سن کر نینسی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ اسے کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ میں نے ہاتھ کے اشارہ سے روکا' سب لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ''ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں' اس لیے ہمارا طرزِ عمل اور رویہ بھی تعلیم یافتہ افراد کی مانند ہونا چاہیے''۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سب کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا: ''محض الزام' جوابی الزام' طنز' طعن و تشنیع کوئی مثبت رویہ نہیں ہے'' ڈورتھی نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کی پُرشکوہ شخصیت' راہبہ کے لباس کا تقدس اور لہجے کی مٹھاس مقابل کو متاثر کرتی تھی۔

''پہلے ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم یہاں مل کے بیٹھے کیوں ہیں؟'' میخائل نے بات آگے بڑھائی' وہ ماسکو کا رہنے والا تھا اور اس کا باپ رشئین آرمی میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔

''اس وقت تمام ٹی وی چینلز اور اخبارات کے لیے سب سے اہم خبر القاعدہ کے رہنما اسامہ بن لادن کی ہلاکت ہے' جسے مبینہ طور پر ایک فوجی آپریشن کے ذریعے ہلاک کیا گیا' جو دنیا بھر میں ہونے والی دہشت گردی کی تمام کارروائیوں' جن میں نائن الیون بھی شامل ہے' کا روح رواں تھا۔ اور یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ امریکی صدر نے بنفس نفیس خود میڈیا کے سامنے آ کر اسکی ہلاکت کا اعلان کیا' جس کے نتیجے میں دنیا بھر کے امن پسند افراد نے بڑی خوشی کا اظہار کیا''۔ میں نے طویل تمہید بیان کی' لیکن اس دوران سب لوگ میری طرف متوجہ رہے' یہ سب باتیں ان کے علم میں بھی تھیں' لیکن ان سب کی توجہ اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ وہ اگلی بات جاننے کے لیے بے چین ہیں' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ''آج صبح جب میں کیفے ٹیریا میں داخل ہوا تو رابرٹ' نینسی' فریڈرک اور جولیا اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے' رابرٹ یہ کہہ رہا تھا کہ ''اسامہ کی موت انسانیت' امن اور تہذیب وتمدن کی فتح ہے' کیا ایسا ہی ہے؟'' میں نے رابرٹ کو مخاطب کر کے دریافت کیا تو اس نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''رابرٹ جس وقت آخری جملے ادا کر رہا تھا' عین اسی وقت میں یہاں پہنچا تھا' مجھے دیکھ کر رابرٹ نے طنزیہ انداز میں زور دے کر آخری جملے کو ادا کیا۔ کم ازکم مجھے یہی محسوس ہوا کہ رابرٹ میرے مسلمان ہونے پر طنز کر رہا ہے''۔ میں نے رابرٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا تو وہ بولا: ''تم نے ٹھیک سمجھا تھا' اگر اس سے تمہاری دل آزاری ہوئی تو میں معافی چاہتا ہوں'' وہ عام امریکیوں کی طرح صاف گو شخص تھا جو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے اور معذرت کرنے میں لمحے بھر کے لیے بھی نہیں ہچکچایا تھا۔ اور اس کی یہ بات مجھے پسند آئی: ''میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ تم مجھ سے معافی مانگو'' میں نے اس سے کہا تو نینسی شوخ لہجے میں بولی:

''تو پھر کیا تم لاء آف ٹارٹ کے تحت رابرٹ پر ہتک عزت کا دعویٰ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟'' وہ رابرٹ کی دوست تھی۔ رابرٹ نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا تو اس بات کا اثر نینسی کے مزاج پر بھی ہوا۔ ان کے گروپ کے بقیہ دو افراد فریڈرک اور جولیا ابھی تک خاموش تھے اس تمام عرصے کے دوران انہوں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ فریڈرک نے مزاحیہ انداز میں کہا: ''اے لڑکے! اگر تم ایسا کوئی ارادہ رکھتے ہو تو اسے ذہن سے نکال دو''۔ میں نے اس کے جملے پر گرہ لگائی: ''کیونکہ مسلمانوں کی توہین پر لاء آف ٹارٹ کا نہیں بلکہ آزادیٔ اظہار رائے کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے'' میرے اس بے ساختہ جملے پر فریڈرک کی ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا اور دیگر حاضرین بھی مسکرانے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاید اب وہ میری بات سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہیں' کیونکہ ان کی مخاصمانہ کیفیت ختم ہوگئی ہے اس لیے میں نے بات آگے بڑھائی۔

''میری یہ خواہش ہے کہ اسلام یا مسلمانوں کے بارے آپ سب کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات یا ابہامات ہیں' ہم ان پر تبادلہ خیال کریں' آج' کل' پھر کسی دن' تاکہ حقائق کے بارے میں ہمارے ذہن صاف ہوں' ہماری سوچ واضح ہو۔ تاکہ ہم کسی بھی غلط فہمی کی وجہ سے' کسی بھی شخص کے دل آزاری کے جرم کا ارتکاب نہ کریں'' میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ تو ڈورتھی نے کہا: ''یہ بالکل ٹھیک ہے؟ کسی

بھی انسان کی دل آزاری' مذہب اور اخلاقیات کی رو سے بدترین جرم ہے''۔

مجھے امریکیوں کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کے نزدیک کسی بھی انسان کی دل آزاری یا توہین انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے' لیکن اس کے باوجود عام طور پر مشرقی لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک ہمیشہ حقارت آمیز ہوتا تھا' میں نے یہاں لفظ لوگوں اس لیے استعمال کیا ہے کیونکہ امریکہ میں مختلف اوقات میں سیاہ فام لوگوں اور مشرق بعید سے تعلق رکھنے والے افراد کے خلاف اس قسم کا رویہ سامنے آتا رہا ہے اور اب یہ رویہ مسلمانوں کے ساتھ اختیار کیا جانے لگا ہے۔ لیکن اس خامی کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ کسی بھی معاشرے میں رائج عقائد اور نظریات اور رسوم و رواج کے مقابلے میں جب کوئی نیا نظریہ' عقیدہ پیش کیا جاتا ہے تو معاشرتی سطح پر اجتماعی طور پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے' لیکن امریکی معاشرے کی یہ خوبی ہے کہ وہاں کوئی بھی شخص اپنے عقیدے اور نظریے کا اظہار بلکہ تبلیغ کر سکتا ہے' میں کوئی عالم یا مبلغ تو نہیں تھا لیکن میری یہ خواہش تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے' میں اپنے ساتھ پڑھنے والے' رہنے والے افراد کے ذہن میں موجود شکوک و شبہات کو ختم کرنے کی کوشش کروں۔ اس کے لیے میں بڑی باقاعدگی سے انٹرنیٹ پر ریسرچ کرتا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں پر کس قسم کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں' اور مختلف اہلِ علم نے ان اعتراضات کے کیا جواب دیئے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ کے سامنے بیٹھنے والا ہر شخص اپنی پسند اور ترجیح کے مطابق ویب سائیٹ وزٹ کرتا ہے' ایک عام شخص کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ انٹرنیٹ کے سامنے بیٹھ کر اسلام کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات کا جواب حاصل کرنا چاہے گا' یہ ہم جیسے عام مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم اس جدید سائنسی ایجاد کو اپنے شعور و آگہی میں اضافے اور اپنے مذہب کی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے استعمال کریں۔ مجھے ڈرورتھی کی یہ بات پسند آئی تھی کہ کسی بھی انسان کی دل آزاری' مذہب اور اخلاقیات دونوں حوالے سے بدترین جرم ہے۔

اسی دوران کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا' میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بلراج سنگھ تھا' امرتسر کا رہنے والا ایک خالص اور روایتی خالصہ' اس کے ساتھ سونیا کماری کھڑی تھی' اتر پردیش کے ضلع فیض آباد کی رہنے والی' وہی فیض آباد جو مرزا محمد ہادی رسوا کے مشہور زمانہ ناول کی ہیروئن امراؤ جان کا وطن مالوف تھا۔ میں اُٹھ کر بلراج سے گلے ملا اور سونیا سے ہاتھ ملایا۔ اسی دوران بلراج نے دو مزید کرسیاں کھینچ لیں۔ ''یہ میرے دوست بلراج سنگھ ہیں' یہاں سکول آف اکنامکس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کر رہے ہیں اور یہ ان کے ساتھ سونیا ہیں' جو انگریزی لسانیات میں ایم فل کر رہی ہیں'' میں نے دیگر حاضرین سے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ نینسی اور رابرٹ' بلراج سے پہلے ہی واقف تھے کیونکہ بلراج اس یونیورسٹی میں میرا واحد بے تکلف دوست تھا' اس لیے ان دونوں نے شناسائی کے اظہار کے لیے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ ''یہ تم لوگ اس ترتیب کے ساتھ کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ کیا کوئی سیر کا پروگرام طے کر رہے ہو؟'' بلراج نے دریافت کیا' اس کا لہجہ خاصا بلند آہنگ تھا' آس پاس کی میزوں پر موجود بعض افراد نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ میں نے اسے ٹہوکا دیا' ''سیر کا

کوئی پروگرام نہیں ہے' ہم یہاں اس طرح سے اس لیے بیٹھے ہیں تا کہ اسلام یا مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات پر تبادلہ خیال کریں اور اس بارے میں صحیح اور غلط سے واقفیت حاصل کریں'' میں نے وضاحت کی تو بلراج' ڈورتھی پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اُردو میں بولا: ''اوئے! تو کہیں اس ''فرشتنی'' کو امپریس کرنے کے چکر میں تو نہیں ہے؟'' یہ اس نے اپنی طرف سے فرشتے کی مؤنث بنائی تھی' اس نے لفظ غلط استعمال کیا تھا لیکن اس کا مفہوم اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھا' واقعی ڈورتھی کے چہرے پر فرشتوں کا سا تقدس تھا' بلراج کی بات صرف سونیا کی سمجھ میں آئی تھی اس لیے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی' اس کی ہنسی پر باقی سب نے حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا' یہ بات آدابِ محفل کے خلاف تھی' میں نے انگریزی میں اسے ٹوکا ''جب کچھ لوگ مل جل کے بیٹھے ہوں تو اس زبان میں بات کرنی چاہیے' جو سب کی سمجھ میں آ بھی جائے''۔ میرے لہجے میں موجود سختی کا کوئی اثر لیے بغیر اس نے دیدے مٹکائے اور کندھوں کو لاپرواہی سے جھٹکا دیا۔ ''ہم اپنی گفتگو کا آغاز آج کی سب سے بڑی خبر سے کرتے ہیں' امریکی فوجیوں کے ہاتھوں اسامہ کی ہلاکت'' میخائل نے حاضرین کو اصل موضوع کی طرف متوجہ کیا: ''میں پوری ایمان داری سے یہ سمجھتا ہوں' اسامہ ایک بہت بڑا دہشت گرد تھا' امن اور انسانیت کا دشمن تھا' انسانوں کے خون کا پیاسا تھا اور اسکی موت انسانیت' امن اور تہذیب و تمدن کی فتح ہے'' رابرٹ نے اپنے پہلے والے الفاظ دہرا دیئے۔ ''اسامہ کے بارے میں جو نیوز اور جو رپورٹس ہم نے دیکھی ہیں' سنی ہیں اور پڑھی ہیں' ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خطرناک جانور تھا جس کا سر کچل دینا ہی بہتر تھا' اور امریکی افواج کے عظیم جوانوں نے اس سانپ کا سر کچل دیا' اس بھیڑیے کو ختم کر دیا' جو اگر زندہ رہ جاتا تو جانے اور کتنی تباہی پھیلاتا'' یہ کہتے ہوئے نینسی کا چہرہ جوش اور غصے کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ اپنے شعور اور فہم و فراست کے اعتبار سے وہ اس سوچ میں بالکل حق بجانب تھی' دوسرے بے شمار امریکیوں کی طرح اس نے بھی کبھی تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے وہی دوسرا رخ اسے دکھانے کے لیے کہا:

''ہم ایک لمحے کے لیے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اسامہ اس کیفے ٹیریا کے سٹور روم میں چھپا ہوا ہے' تو کیا ہم امریکی ائرفورس کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ کارپٹ بمبنگ کر کے' یا ڈرون اٹیک کر کے اس پورے کیفے ٹیریا کو' اس میں بیٹھے ہو ہم سب افراد کو نیست و نابود کر دے؟'' میں نے دیگر حاضرین پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر نینسی کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''لیکن ایسا کب ہوا' امریکی افواج کے سپاہیوں نے کمانڈو ایکشن کر کے اسامہ کو ہلاک کیا ہے'' نینسی کے لہجے میں بدستور تپش تھی۔ ''میرا یہ سوال نہیں ہے کہ اسامہ کو کیسے ہلاک کیا گیا؟'' میں نے نرمی سے کہا کیونکہ میرا مشتعل ہونا مناسب نہیں تھا۔ ''میں نے یہ پوچھا ہے کہ اگر اسامہ اس کیفے ٹیریا کے سٹور روم میں چھپا ہوا ہو تو کیا ہم یا دنیا کا کوئی بھی باشعور' مہذب' پڑھا لکھا فرد اس بات کی اجازت دے گا کہ امریکی فضائیہ کے لڑاکا طیارے یا دنیا کی کوئی بھی دوسری قوت اس پورے کیفے ٹیریا کو' یہاں بیٹھے ہوئے نہتے' معصوم اور بے گناہ افراد کو ختم کر دے؟'' میرے اس

سوال کے جواب میں خاموشی چھائی رہی' کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''مغربی فلسفہ قانون تو ہمیں یہ پڑھاتا ہے' بتاتا ہے' سکھاتا ہے کہ آپ دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے کسی مجرم کو زیادہ سخت سزا نہیں دے سکتے' کیونکہ دوسروں کو عبرت دلانا مجرم کی ذمہ داری نہیں ہے' اس نے جتنا جرم کیا ہے' صرف اس کے مطابق اسے سزا دی جائے''۔ میں لمحے بھر کے لیے رکا تو یانگ نے اس بات میں اضافہ کیا: ''یہی فلسفہ قانون' ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ آپ کو اصل نفرت جرم سے کرنی چاہیے مجرم سے نہیں'' یانگ نے بات ختم کی تو میخائل بولا: ''میں رشئین ہوں' ایک پکا کمیونسٹ' میرا باپ رشئین آرمی کا جنرل ہے' دادا بھی رشئین افواج کا بڑا افسر تھا' مجھے یہ بات اچھی طرح پتہ ہے کہ مسلمان لڑاکے ہوتے ہیں' لڑنے بھرنے کے لیے انہوں نے ''جہاد'' کی مذہبی اصطلاح بنا رکھی ہے اور اسی کو استعمال کر کے امریکیوں نے مسلمانوں کو رشئین آرمی سے لڑایا تھا' رشئین آرمی کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کیا تھا' جس کے نتیجے میں سوویت یونین کے حصے بخرے ہو گئے' اب یہی ''جہاد'' تم امریکیوں کے خلاف ہو رہا ہے' تو تم چیختے ہو: یہ دہشت گردی ہے' ظلم ہے' بربریت ہے'' ڈورتھی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''لیکن جو چیز غلط ہے اسے غلط ہی کہا جائے گا خواہ وہ کسی کے بھی خلاف ہو اور کسی کی طرف سے بھی ہو'' تو میخائل اچھل ہی پڑا۔ ''دیکھیے محترمہ! ہمارا ملک دنیا کی عظیم ترین طاقت تھا' جسے ان امریکیوں نے انہی مسلمان مجاہدین کے ساتھ مل کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا' آپ سلویسٹر اسٹالن کی ''ریمبو تھری'' دیکھیں۔ جان ریمبو کس طرح مجاہدین کو رشئین کے خلاف لڑاتا رہا ہے۔ جب امریکن ہمارے گھر کو آگ لگا رہے تھے' اس وقت تو کسی امریکی نے یہ نہیں کہا کہ سوویت یونین کی سالمیت خطرے میں ہے''۔ ڈورتھی اس کے جواب میں خاموش رہی۔

میخائل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا: ''افغان مجاہدین رشئین آرمی کے خلاف کیوں لڑے تھے؟ اس لیے کہ رشئین افواج ان کے ملک میں' ان کی سرزمین میں' ان کی پسند کے خلاف آ گئی تھیں' تو آج امریکیوں نے بھی تو یہی کیا ہے' انہوں نے بھی اپنی افواج افغانستان میں داخل کر دی ہیں' اب اگر کچھ افغان ان کے خلاف لڑ رہے ہیں تو امریکیوں کو اعتراض کیوں ہے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ افغانستان کے دارالحکومت کابل کی انتظامیہ ہمارے ساتھ ہے اور اس نے ہماری افواج کو افغانستان آنے کی اجازت دی ہے تو شرارتی لڑکے! جس وقت رشئین آرمی افغانستان میں داخل ہوئی تھی اس وقت کی کابل انتظامیہ روس نواز تھی''۔ میخائل کا لہجہ کافی تلخ ہو چکا تھا۔ اس کے انداز سے یہ لگتا تھا کہ اگر اس کے بس میں ہو تو وہ افغانستان کو امریکی افواج کا قبرستان بنا دے۔ ''رشئین افواج کے خلاف لڑائی کمیونزم کے خلاف تھی۔ جبکہ امریکی افواج افغانستان میں امن کے قیام کے لیے موجود ہیں'' فریڈرک نے مدافعانہ لہجے میں یہ بات کہی تو میخائل نے تالی بجائی: ''بہت خوب! کمیونزم' ملا ازم' خواہ جو بھی ازم ہو' اگر وہ امریکی ازم کے خلاف ہے تو تم اسے نیست و نابود کر دو گے؟ ہاں؟ ان ملکوں کے حصے بخرے کر دو گے؟ ان کے خلاف لڑنے والوں کی مالی اور عملی مدد کرو گے؟ خوب بہت خوب! اور یہ تم امریکی دنیا بھر کے پولیس مین کس خوشی میں بن گئے ہو؟ دنیا بھر میں قیام امن کے لیے تمہاری فورسز کا وہاں موجود ہونا انتہائی ضروری ہے''۔ اب کی مرتبہ نینسی

نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا: ''امریکی افواج افغانستان اور دیگر ملکوں میں UNO کی قراردادوں کے تحت گئی ہیں'' تو میخائل بولا: ''یہ UNO کیا چیز ہے؟ اسے دنیا بھر میں تھانے داری کے لیے امریکہ ہی کیوں دستیاب ہوتا ہے؟'' تو نینسی نے جواب دیا: ''ایسا نہیں ہے بلکہ امریکہ کے ساتھ دیگر اتحادی ممالک کی افواج بھی وہاں موجود ہیں'' یانگ نے بیچ میں دخل دیا: ''میں ایک سوال کرسکتا ہوں؟'' اس نے نینسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو نینسی نے اثبات میں سر ہلا دیا: ''UNO کے ممبران میں بڑے ممالک کون کون سے ہیں؟''

نینسی کے جواب دینے سے پہلے فریڈرک نے کہا: ''امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس، چین وغیرہ'' تو یانگ نے سوال کیا: ''پھر کیا وجہ ہے کہ افغانستان میں اس کے قریبی دو بڑے ممالک یعنی چین اور روس کی افواج تو موجود نہیں ہیں اور سات سمندر پار سے امریکہ اور اس کے حاشیہ بردار برطانیہ کی افواج موجود ہیں؟'' اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

مجھے اس وقت چند برس پہلے کا واقعہ یاد آ گیا' جب امریکہ میں سعودی عرب نے اپنی فوجیں بھجوائیں اور عراق کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا تو لاہور کی ایک مذہبی تنظیم نے کچھ عراقی علماء کو بلایا جنہوں نے بڑے زوروشور کے ساتھ امریکہ کے خلاف جہاد کرنے پر زور دیا اور حاضرین کی یہ کیفیت تھی کہ وہ الجہاد الجہاد لبیک لبیک' کے نعرے لگا رہے تھے' اسی جہادی ماحول میں ایک ماڈرن نظر آنے والے دانشور کو خطاب کی دعوت دی گئی تو اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ''میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ یہاں عراق سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم تشریف لائے ہیں۔ وہ عراق جو امام ابوحنیفہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا وطن ہے' جن کے ہم ماننے والے بھی ہیں اور جن کے ہم چاہنے والے بھی ہیں۔ میرا یہ خیال تھا کہ یہ عراقی اہلِ علم ان بزرگوں کے ساتھ نسبت کی وجہ سے روحانی اور علمی باتیں کریں گے' لیکن مجھے یہاں آ کر بہت افسوس ہوا ہے کہ یہ لوگ صرف امریکہ اور یواین او کے خلاف بولتے رہے ہیں۔ آپ حاضرین مجھے صرف ایک بات بتائیں' آپ کو یہ کس نے بتایا ہے کہ یواین او مسلمانوں کو اقوام عالم سے' ان کے حقوق دلانے کی ٹھیکیدار ہے یا امریکیوں نے مسلمانوں کے حقوق کی فراہمی اپنے ذمے لی ہے۔ مجھے بہت افسوس سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ شاید آپ میں سے کسی کو بھی یواین او کی تاریخ کا پتہ نہیں ہے۔ یہ اہلِ مغرب نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے بنائی ہے'' کئی برس پہلے کی سنی ہوئی یہ بات مجھے یانگ کا سوال سن کر یاد آئی' لیکن یانگ کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا' اس لیے سب کچھ دیر کے لیے خاموش رہے۔ پھر ڈورتھی نے بات شروع کی: ''ہم جس دنیا میں رہتے ہیں یہ مختلف ریاستوں کی شکل میں تقسیم ہے۔ ہر جگہ اور ہر خطے کے اپنے مخصوص رسم و رواج ہیں' تہذیب و تمدن ہے' نظریاتی و اعتقادی پس منظر ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے مخصوص مفادات ہیں'' میں نے اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ''اور ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ان مفادات کا تحفظ اس خطے کے تمام افراد نہیں کرتے ہیں' بلکہ چند مخصوص افراد اس تحفظ کی ذمہ داری اپنے ذمہ لیتے ہیں اور پھر بعد میں ان کی جگہ آنے والے لوگ سابقہ پالیسی کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں'' میخائل نے میری بات کی تائید کی: ''یہ تم نے

ٹھیک کہا ہے‘ عملی طور پر ہوتا یہ ہے کہ ان مفادات کا تحفظ تنظیمی شکل میں کیا جاتا ہے‘‘ تو یانگ نے لقمہ دیا: ’’جس طرح سی ئی اے امریکی مفادات کے تحفظ کا سب سے بڑا ادارہ ہے‘‘ تو میں نے دخل دیا: ’’سی آئی اے ایک بہت بڑا ادارہ ہے‘ اس کی پالیسیوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے‘ کیونکہ اس کے ماہرین کی بنائی ہوئی پالیسیاں مخصوص افراد کی سوچ کی عکاس ہوتی ہیں۔ اور پھر ان پالیسیوں کو ٹاک شوز‘ ریسرچ پیپرز‘ نیوز پیپرز کے ذریعے عام امریکیوں کے ذہن میں اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ وہ یہی سمجھتا ہے‘‘۔ یانگ نے پھر لقمہ دیا: ’’یہی سمجھتا ہے کہ امریکہ اور پوری دنیا کے عظیم ترین مفاد میں یہی ہے کہ ایسا ہی کیا جائے‘‘ میں نے مسکرا کر یانگ کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی: ’’کوئی بھی عام امریکی یہ نہیں سوچ سکتا کہ سی آئی اے کے افسران خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ افراد ہیں‘‘ تو میخائل نے کہا: ’’وہ تو کسی عام پڑھے لکھے شریف با شعور شخص کے نزدیک بھی پسندیدہ نہیں ہو سکتے‘‘۔ بلراج بولا: ’’تم کہنا کیا چاہتے ہو؟‘‘ میں نے کہا: ’’میں یہ نکتہ اُٹھانا چاہ رہا تھا کہ جس طرح سی آئی اے کے عام اہل کار اپنے بڑوں کی بنائی ہوئی پالیسیوں کو من وعن‘ حرف بحرف درست سمجھتے ہیں اور پیشہ ورانہ طور پر انہیں نافذ کرنے کے پابند ہوتے ہیں‘ اسی طرح کی صورتِ حال ان لوگوں کو بھی درپیش ہوتی ہے جن کے خلاف سی آئی اے کام کر رہی ہوتی ہے‘‘۔ فریڈرک نے کہا: ’’تمہارا مطلب ہے کہ اب امریکی افواج کے سپاہی یا سی آئی اے کے کارکنان پہلے اس بات کا جائزہ لیں کہ ہمیں جو حکم ملا ہے‘ وہ صحیح ہے یا غلط اور پھر اس پر عمل کریں‘‘۔

تو نینسی نے طنزیہ انداز میں کہا: ’’پھر تو وہ بیٹھے حساب کتاب کرتے رہ جائیں گے اور یہاں ایک اور نائن الیون ہو جائے گا‘‘۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پایا اور بولا: ’’نائن الیون کرنے والے اُجڈ گنوار انتہا پسند تھے لیکن امریکی فوج تو ایک تہذیب و ترقی یافتہ ملک کی پیشہ ورانہ طور پر تربیت یافتہ فوج ہے‘ وہ کارپٹ بمبنگ اور ڈرون اٹیک کے ذریعے بے گناہوں کو کیوں مار رہی ہے؟‘‘ یانگ نے پھر لقمہ دیا: ’’عالمی ردِعمل کا خوف نہ ہو تو امریکہ‘ جاپان کی طرح افغانستان اور عراق پر بھی ایٹم بم پھینک چکا ہو‘‘ تو میخائل نے کہا: ’’یہ امریکی ریاست کے وجود پر بدنما داغ ہے کہ انسانیت کے خلاف ایسے مہلک ترین ہتھیار کا استعمال صرف امریکہ نے ہی کیا اور وہ بھی عام بے گناہ افراد پر‘‘۔

ذرا سی دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی‘ وہاں موجود افراد میں فریڈرک‘ رابرٹ‘ جولیا اور نینسی یہ چاروں ہی امریکی تھے‘ ان سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا تو یانگ بولا: ’’کسی زخم کے پرانے ہو جانے سے اس کی یاد ختم نہیں ہو جاتی۔ ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹمی حملہ نائن الیون سے بڑی تباہ کاری تھی اور وہ بھی ایک باقاعدہ ریاست کی باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ فوج کے ہاتھوں ہوئی تھی‘‘۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ’’تم نے ٹھیک کہا تھا امریکیوں کی سوشل سائنس انسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتی ہے: امریکی‘ نان امریکی اور مسلمان‘‘۔

یانگ نے میرا جملہ دُہراتے ہوئے اس کی تصدیق کی تھی لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہونے کے باوجود اس موقع ومحل کے لیے اس حوالے سے منفی حیثیت رکھتی تھی کہ اس کے نتیجے میں رابرٹ اور اس کے گروپ کے بقیہ تینوں افراد مشتعل ہو کر وہاں سے اُٹھ کر جا سکتے تھے اور یہ بات مجھے منظور نہیں تھی۔ رابرٹ کے گروپ میں سے جولیا نے اب تک کچھ نہیں کہا تھا۔ میں اس سے نام اور چہرے کی حد تک شناسا تھا۔ جب سکوت کا دورانیہ زیادہ ہو گیا تو جولیا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا: ''میں نہایت شرمندگی' ندامت اور افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرتی ہوں کہ ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکہ کی طرف سے کیا جانے والا ایٹمی حملہ انسانیت' اخلاقیات اور تہذیب وتمدن کے عمومی ضابطۂ اخلاق کی بدترین خلاف ورزی تھا۔'' جولیا کا لہجہ بہت نرم تھا' اس نے متانت کے ساتھ اپنی غلطی کا بلکہ اپنی ریاست کی غلطی کا اعتراف کیا' لیکن میخائل پر اس کے لہجے کی عاجزی اور متانت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بولا: ''تم نے لفظ خلاف ورزی غلط استعمال کیا ہے' یہ انسانیت اور تہذیب وتمدن کے ضابطہ اخلاق کی بے حرمتی ہے بلکہ اس کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں اور صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ ان دھجیوں کو آگ بھی لگا دی گئی اور اس آگ کے اثرات آگے آنے والی نسلیں بھی بھگت رہی ہیں۔'' امریکہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ کوئی بھی شخص کسی ہچکچاہٹ اور خوف کے بغیر اپنا موقف بیان کر سکتا ہے اور اس کا مدمقابل اسے سننے کا پابند ہوتا ہے۔ میخائل کی بات ختم ہوئی تو بلراج سنگھ نے پرسوچ انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''یار تم پاکستانی ہم سکھوں کے بارے میں مختلف لطیفے بناتے اور سناتے ہو لیکن تم لوگ خود' صرف تم پاکستانی ہی نہیں' بلکہ تم سب مسلمان کتنے بے وقوف ہو کہ تم میں سے کسی ایک نے بھی نائن الیون کے جواب میں امریکیوں کو ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے کا طعنہ نہیں دیا۔'' میں اس کی سادگی پہ مسکرا دیا۔ ''میرے دوست! یہ گاؤں کے دو افراد کی آپس میں ناراضگی کا مسئلہ نہیں ہے جو طعنے دے کر دوسرے فریق کی عزت کم کرنے کی کوشش کی جائے۔''

کہنے کو تو میں نے بلراج کو یہ بات کہہ دی تھی لیکن اسکی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک تھی' آج جب ہر جگہ ہر چینل' ہر اخبار میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ مسلمان امن کے دشمن ہیں تو دنیا میں کسی ایک شخص کو تو امریکیوں کو یہ آئینہ دکھانا چاہیے کہ اس سے زیادہ سنگین دہشت گردی کا ارتکاب تو تم لوگوں نے کیا ہے کیونکہ دہشت گردی کے کسی بھی واقعے میں عام طور پر وہی افراد متاثر ہوتے ہیں جو براہِ راست اس کی زد میں آتے ہیں لیکن ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکیوں کے ایٹمی حملے کی سزا کو وہاں کے رہنے والوں کی آنے والی نسلیں بھگت رہی ہیں اور آئندہ بھی بھگتیں گی یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ کسی کی غلطی کو اپنی غلطی کا جواز نہیں بنا سکتے۔ لیکن اسے سمجھانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں کہ بھائی! تم میری جس ناکردہ غلطی کی وجہ سے میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہو اس سے زیادہ سنگین غلطی کے مرتکب تو تم خود ہوئے ہو اس لیے میرے ساتھ اپنے رویے کے بارے میں نظرِثانی کرو۔ عام طور پر جب میں تنہا بیٹھ کر اس موضوع پر غور کرتا ہوں

تو ہمیشہ یہی پہلو میرے سامنے آتا ہے کہ دنیا کا کوئی ایک مؤقر ٹیلی ویژن چینل' نشریاتی ادارہ' اخبار' میگزین کسی مسلمان کا نہیں ہے' بلکہ یہ سب تو بہت دور کی بات ہے۔ بین الاقوامی سطح کا کوئی ایک مصنف یا دانشور بھی مسلمان نہیں ہے۔

میری دعوت پر ہمارے ساتھ کی میزوں سے اُٹھ کر جو افراد اس مذاکرے میں شریک ہوئے تھے' ان میں سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا ایک نوجوان بھی تھا' اس نے یونیورسٹی کے عام طلباء کے برعکس اپنی شرٹ کے بٹن بڑے سلیقے سے بند کیے ہوئے تھے' اپنے لباس سے وہ کوئی نفاست پسند خوشحال شخص محسوس ہوتا تھا' اس نے بات کا آغاز کیا تو اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ وہ برطانوی ہے۔

''میرا نام ولیم ہے تم نے جب ہمیں ڈسکشن میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی تو یہ کہا گیا تھا کہ ہم اسلام کے بارے میں تبادلۂ خیال کریں گے لیکن میں جب سے یہاں آ کر بیٹھا ہوں اس وقت سے اب تک تمام تر گفتگو امریکیوں کی مذمت کے گرد گھوم رہی ہے۔'' اس کا لہجہ روایتی انگریزوں کی طرح سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا' لیکن الفاظ کے انتخاب میں طنز کا پہلو موجود تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ سیاسی اور تہذیبی پس منظر کے اعتبار سے وہ امریکیوں کے زیادہ قریب تھا' اس کی بات سن کر مجھے بھی احساس ہوا کہ ہم اپنے موضوع سے کچھ ہٹ گئے ہیں لیکن میں میخائل یا یانگ کو امریکیوں کے خلاف بولنے سے نہیں روک سکتا تھا بلکہ ان دونوں کی گفتگو کے بعد مجھے اس بات کا شعوری احساس ہوا کہ دنیا بھر میں امریکہ اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا روایتی حریف سمجھا جا رہا ہے حالانکہ تہذیبی پس منظر کے حوالے سے چین اور روس اپنے حامیوں اور متعلقین سمیت امریکہ سے اتنے ہی دور ہیں' جتنے مسلمان دور سمجھے جاتے ہیں' لیکن موجودہ وقت میں امریکہ اور مسلمانوں کو حریف اس لیے سمجھا جا رہا ہے کیونکہ رِنگ میں اس وقت یہی دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بزرگوں کی کہی ہوئی وہ بات بھی یاد آئی کہ دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے' لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی امریکی جارحیت کے دفاع میں دنیا کی دو بڑی طاقتوں روس اور چین کو صحیح طریقے سے استعمال نہیں کیا' لیکن یہ وقت ان غلطیوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ اس دوران ڈورتھی اپنی بات شروع کر چکی تھی ''ہمیں سب سے پہلے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ امریکہ دنیا کا ایک بڑا جمہوری ملک ہے۔'' میخائل نے اسے لقمہ دیا: ''اور دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کی تمام تر جمہوری اقدار صرف اپنے شہریوں کے لیے ہیں۔'' جولیا نے کہا: ''یقیناً ایسا ہی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کسی بھی ریاست کی تمام تر جمہوری اقدار صرف اس ریاست کے اپنے شہریوں کے لیے ہوتی ہیں۔'' میخائل نے تند و تیز لہجے میں کہا: ''اور دوسری ریاستوں پر ان جمہوری اقدار کا کوئی اطلاق نہیں ہوتا؟'' میخائل نے لفظ ''جمہوری'' کو چبا کر ادا کیا تو جولیا نے فوراً کہا: ''بالکل ایسا ہی ہے کیا روس نے دوسری ریاستوں کو اپنے زیر تسلط لانے اور زیر تسلط رکھنے کی کوشش نہیں کی؟ اور کیا اس نے وہاں کے عوام کو بھی وہ تمام بنیادی حقوق فراہم کیے جو روسی عوام کو حاصل تھے؟'' میخائل کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جولیا نے اپنی بات جاری رکھی: ''روس دوسروں کو تو ایک طرف رہنے دو' وہاں تو ریاست کے اپنے عوام کو بھی بنیادی ریاستی حقوق حاصل

نہیں ہیں، وہ ایک لطیفہ بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک امریکی اور ایک روسی کے درمیان اس بارے میں بحث ہوگئی کہ امریکہ اور روس میں سے کون سے ملک میں اظہارِ رائے کی زیادہ آزادی ہے‘ تو امریکی نے کہا: امریکہ میں اظہارِ رائے کی اتنی آزادی ہے کہ کوئی بھی امریکی وائٹ ہاؤس کے باہر کھڑا ہو کر امریکی صدر کو جتنی چاہے گالیاں دے سکتا ہے‘ تو روسی نے کہا: اتنی آزادی تو روس میں بھی حاصل ہے‘ کوئی بھی روسی شخص روسی صدر کی سرکاری رہائش گاہ لینن گراڈ کے باہر کھڑے ہو کر امریکی صدر کو جتنی چاہے گالیاں دے سکتا ہے۔'' یہ لطیفہ سناتے ہوئے جولیا کے لہجے کی تیزی بتدریج نرمی میں ڈھلتی چلی گئی اور آخری جملہ اس نے مسکراتے ہوئے ادا کیا‘ جسے سن کر فریڈرک کھلکھلا کر ہنس پڑا‘ باقی سب لوگ بھی مسکرانے لگے۔ میخائل کے ہونٹوں پر بھی جھینپی ہوئی ہنسی تھی‘ ماحول ایک مرتبہ پھر تلخ ہونے کے بعد پرسکون ہوگیا تھا لیکن یہ میری غلط فہمی تھی‘ جولیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن ذہن بدستور تلخ تھا‘ اس نے اگلا حملہ مجھ پر کیا‘ مجھے مخاطب کرتے ہوئے وہ بولی: ''یہی حال تم مسلمانوں کا ہے تم لوگ مکہ سے چلے اور عیسائیوں کی سرزمین شام کو فتح کرلیا‘ آتش پرستوں کے خطے ایران کو فتح کرلیا‘ جہالت کے گڑھ افریقہ کے آخری کنارے تک پہنچ گئے‘ پھر یورپ میں داخل ہوگئے۔'' سونیا کماری نے بیچ میں اضافہ کیا: ''انہوں نے ہندوستان کو بھی فتح کیا اور پھر کئی صدیوں تک وہاں حکومت بھی کی۔'' جولیا کو اس کا لقمہ پسند آیا‘ اس نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے روایتی لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچاتے ہوئے کہا: ''مسلمانوں نے صرف ان خطوں کو فتح ہی نہیں کیا بلکہ وہاں حکومت بھی کی اور صرف حکومت کرنے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ وہاں کے رہنے والوں کو مسلمان بھی کرلیا۔'' اس کی اس بات پر فریڈرک نے دیدے مٹکائے۔ ''واؤ! بھئی یہ مسلمان تو بہت عظیم ہوتے ہیں۔'' تو جولیا نے اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: ''تم ان کی عظمت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔'' تو فریڈرک نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا: ''اچھا تم مجھے ان کی عظمت کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' میں خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا‘ ابھی میرا کسی بات میں دخل دینا مناسب نہیں تھا‘ ویسے بھی جولیا جو کچھ کہہ رہی تھی‘ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ ''تم مسلمانوں کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ کسی بھی ایک مسلمان ملک میں آزاد جمہوری نظام نہیں ہے۔'' فریڈرک کی رگ ظرافت پھر پھڑک اٹھی۔ ''تمہارا کہنے کا یہ مطلب ہے کہ کسی بھی مسلمان ملک کے صدر کی رہائش گاہ کے باہر کھڑا ہو کر کوئی بھی مسلمان ''امریکی صدر'' کو جتنی چاہے گالیاں نہیں دے سکتا۔'' اس بات پر پھر سب ہنسنے لگے‘ میں نے ہنستے ہوئے سوچا کہ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ دنیا کے تمام اسلامی ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں تھا جہاں امریکہ کی طرح کی آزادی اظہارِ رائے تو دور کی بات ہے‘ اس کا عشرِ عشیر بھی موجود ہو‘ باقی ریاستی حقوق تو بہت دور کی بات ہے‘ جولیا اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی: ''اسلامی ممالک کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے اپنے خیالات جھٹک کر اپنی پوری توجہ اس کی طرف مبذول کی۔ ''ایک قسم ان اسلامی ممالک کی ہے جہاں کی حکومتیں امریکی بلاک کا حصہ ہیں۔'' مجھے معلوم تھا جولیا نے ''امریکی بلاک'' کی ترکیب تہذیب کے دائرے میں رہنے کے

لیے استعمال کی تھی وگرنہ اس ''بلاک'' سے تعلق رکھنے والی حکومتیں امریکی انتظامیہ اور سی آئی اے کی مرضی سے برسراقتدار آتی ہیں‘ رہتی ہیں اور ختم ہوتی ہیں‘ امریکی ان حکمرانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیتے ہیں اور اپنے کام کے لیے انہیں مزید ٹشو پیپر مل جاتے ہیں جو وہائٹ ہاؤس نہیں بلکہ امریکی سفارت خانے کی طرف منہ کر کے زبان حال سے چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے ہوتے ہیں: اے خانہ برانداز چمن! کچھ تو ادھر بھی‘ لیکن میری اس سوچ سے بے خبر جولیا اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ ''امریکی بلاک سے تعلق رکھنے والے اسلامی ممالک میں سے کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کی حکومت امریکہ سے امداد نہیں لیتی‘ یہ امداد مالی بھی ہو سکتی ہے‘ سیاسی اور فوجی بھی۔'' میں وہاں موجود حاضرین میں ''اکلوتا'' مسلمان تھا‘ اس لیے یہ سب معلومات میری عزت افزائی شمار ہونی چاہیے تھی‘ اسی لیے فریڈرک‘ نینسی اور رابرٹ کی نظریں بار بار میری طرف اُٹھ رہی تھیں۔ باقی حاضرین بھی اس بات کو محسوس کر رہے تھے‘ آخر بلراج سے نہیں رہا گیا تو وہ بول پڑا: ''امداد دینے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ دوسرے شخص کو اپنا غلام سمجھ لیں۔'' جولیا نے بڑے تحمل سے بلراج کی یہ بات سنی‘ اس کے ماتھے پر کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی‘ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب تھا‘ کیونکہ جس سوال اور اعتراض کا جواب انسان کے پاس موجود نہ ہو‘ فطری ردِّعمل یہی ہوتا ہے کہ ایسے سوال کو سن کر انسان فوراً مشتعل ہو جاتا ہے۔ ''امریکی کس ملک کے باشندوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں؟'' بلراج کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ''امریکی تعلیمی اداروں‘ تجارتی اداروں‘ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں‘ کس ملک کے باشندے کو برابری کی بنیاد پر‘ میرٹ پر‘ اپنی صلاحیتوں کے مطابق فائدہ اُٹھانے کا موقع نہیں دیا جاتا؟'' جولیا کے اس سوال کا جواب ہم سب خود تھے‘ جو دنیا کے مختلف ممالک سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے‘ اور ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ اس کی قابلیت‘ صلاحیت اور خدمات کا جو صلا اسے امریکہ میں مل سکتا ہے وہ اور کہیں نہیں مل سکتا‘ اور ہم میں سے ہر ایک اس بات سے بھی واقف تھا کہ یہ امریکی نظام کی خوبی ہی ہے کہ ہم میں سے کسی کا بھی بس چلتا تو وہ اپنے کسی دوسرے عزیز‘ رشتہ دار‘ دوست وغیرہ کو امریکہ بلوانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔'' رابرٹ کے الفاظ میں ہمارے دوست کو جو طنز محسوس ہوا تھا‘ وہ ایک فطری ردِّعمل تھا‘ کیوں کہ نشریاتی ذرائع سے جو معلومات ایک عام فرد تک پہنچتی ہے‘ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض انتہاء پسند مسلمان دنیا کے امن کے لیے خطرہ ہیں۔'' جولیا بڑے سلیقے کے ساتھ بات کو اسی نکتے پر لے آئی تھی جہاں سے بات شروع ہوئی تھی۔ اس کے لمبوترے چہرے‘ پھیکی رنگت اور عام سے لباس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جو کسی مرد کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا سکتی لیکن اس کی ذہانت نے وہاں بیٹھے ہوئے سب مردوں کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ اس اعتبار سے کہ ہم جو بڑھ چڑھ کر امریکہ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے‘ اب خاموش تھے۔ بلکہ ہمیں امریکہ کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ محسوس ہو رہا تھا‘ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہمیں آئینہ دکھایا تھا اور ساتھ میں یہ باور بھی کروا دیا تھا کہ ہم امریکہ پر جو بھی اعتراض کریں گے‘ اس کا کوئی نہ کوئی پہلو ہمارے اندر بھی موجود ہوگا‘ اس کی گفتگو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ لوگوں کو

امریکہ سے جو شکایات ہیں' اس نوعیت کی خامیاں ان کے اپنے اندر بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس امریکی معاشرے کے جو مثبت پہلو ہیں' وہ دوسری جگہوں پر بہت کم پائے جاتے ہیں۔

جولیا نے اپنی بات کو وہیں سے شروع کیا جہاں بلراج نے ختم کیا تھا۔ ''میں آپ کو یہ بتا رہی تھی کہ دنیا کا ہر اہم اسلامی ملک امریکہ سے امداد لیتا ہے۔ اور آپ مجھے بتائیں کہ دنیا کا کون سا ایسا اسلامی ملک ہے جہاں کے شہریوں کو وہ بنیادی سہولیات حاصل ہیں جو انہیں امریکہ میں حاصل ہیں؟'' ہم سب اس کے جواب میں خاموش رہے۔ تو وہ بولی: ''میرا مقصد کسی کی تضحیک یا تحقیر نہیں ہے' لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ بعض افراد امریکہ میں آ کر اعلیٰ تعلیم' اچھی ملازمت' زندگی کی بہترین سہولیات حاصل کرتے ہیں' لیکن وہ امریکی ریاست اور یہاں کے معاشرے کو دل و جان سے قبول نہیں کرتے' ان کا نفسیاتی اور روحانی تعلق اسی خطے سے برقرار رہتا ہے جہاں سے ہجرت کر کے وہ امریکہ آئے ہوتے ہیں اور اپنے اس آبائی خطے کے ساتھ ان کا یہ ذہنی تعلق اور جذباتی وابستگی اتنی شدید ہوتی ہے کہ یہ لوگ دوبارہ وہاں واپس بھی نہیں جانا چاہتے۔'' ہمارے پاس اس طنز کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ''میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہ دو غلا طرزِ عمل انتہائی نامناسب ہے۔ ہمارے دوست نے کہا تھا کہ امریکہ ریڈ انڈین کا خطہ ہے۔'' جولیا نے یانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''میں مانتی ہوں کہ مجھ سمیت اکثر امریکیوں کے آباء واجداد دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے لیکن اب ہماری تمام ذہنی اور جذباتی وابستگی امریکی ریاست' اس کی حکومت' اس کے مفادات کے ساتھ ہے۔'' جولیا نے جو سوال اُٹھایا تھا وہ بہت اہم تھا۔ اس کی یہ بات بالکل درست تھی' حقیقت یہی تھی کہ مشرقی اور مغربی اقوام سے تعلق رکھنے والے افراد کا امریکہ کے بارے میں مجموعی رویہ مختلف تھا۔ آبنائے باسفورس کے مشرقی سمت میں بسنے والی اقوام امریکہ معاشرے کا بڑا حصہ بن جانے کے باوجود ذہنی طور پر امریکی معاشرے کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکیں۔ اس کے برعکس آبنائے باسفورس کے مغربی جانب رہنے والے افراد جب امریکہ کا رخ کرتے ہیں' تو وہ امریکی ریاست کو ہی اپنے آبائی خطے کی طرح اپنا اور اپنے بچوں کا وطن سمجھ کر رکھتے ہیں۔ ''اگر کچھ منفی رویے امریکیوں کی طرف سے سامنے آتے ہیں تو اس پر آپ لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے' لیکن امریکی معاشرے کے بارے میں اپنے اس منفی رویے کی آپ لوگ کیا توجیہہ پیش کریں گے؟'' جولیا کے اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا' ہم سب خاموش رہے۔

برطانوی شخص نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: ''ہم اسلام کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔'' تو میں نے اسے جواب دیا: ''جی ہاں! میں آپ سب کو دعوت دیتا ہوں کہ اسلام کے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی ابہام' کوئی سوال ہو تو وہ آپ سامنے رکھیں' ہم اس کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں گے' تاکہ ہم میں سے کسی کے ذہن میں کوئی غلط فہمی' ابہام' اُلجھن ہو تو وہ دور ہو جائے۔'' تو وہی برطانوی بولا: ''لیکن ہمیں اسلام کے بارے میں کچھ جاننے یا کسی غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت کیا ہے؟'' یہ ایک

ٹیڑھا سوال تھا۔اس کا سادہ سا روایتی جواب تو یہ تھا کہ اسلام دین حق ہے اور دین حق کی پیروی کرنا ہر انسان پر لازم ہے' لیکن یہ بات اسے سمجھ نہیں آنی تھی' اس سوال کا کوئی ایسا جواب ہونا چاہیے تھے جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہو' مجھے جواب دیتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ اس نے اپنے سوال میں لفظ ''ہمیں'' یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔یعنی رابرٹ اور اس کے گروپ کے امریکن نژاد افراد کے ساتھ روس سے تعلق رکھنے والے میخائل اور چین کے رہنے والا یانگ کے لیے بھی وہ جواب قابل قبول ہونا چاہیے' اور سب کے ساتھ ان افراد کے لیے بھی جو اپنی کرسیاں گھسیٹ کر ہمارے ساتھ اس بحث میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ کہتے ہیں: شاعری نصف پیغامبری ہوتی ہے۔غالب نے کہا تھا: ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'' میں نے خود کو اس مصرعہ کا عملی مصداق اس وقت محسوس کیا جب اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا' جو یقیناً ''نوائے سروش'' تھا۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق کسی بھی مسلمان مفکر یا داعی نے اس سے پہلے یہ نکتہ نہیں اُٹھایا تھا۔لیکن اس کے باوجود مجھ جیسے خطا کار' گناہگار' کم علم مسلمان کے ذہن میں اس خیال کا آ جانا' تائید غیبی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ میں نے ایک نظر جملہ حاضرین پر ڈالتے ہوئے دریافت کیا: ''میں آپ سب کا یونیورسٹی فیلو ہوں' میں یہ کہتا ہوں: ارسطو اور افلاطون بے کار لوگ تھے' عمانوئیل کانٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہے' آئزک نیوٹن ایک عام آدمی تھا' شیکسپیئر کو خوامخواہ لوگوں نے چڑھایا ہوا ہے' آئن سٹائن صرف ایک شرپسند (ٹیررسٹ) تھا۔'' تو میخائل بولا: ''تمہاری آخری بات ٹھیک ہے۔ آئن سٹائن واقعی ایک شرپسند تھا۔'' یانگ نے لقمہ دیا: ''کیونکہ اس نے ایٹم بم ایجاد کیا تھا۔'' یہ سن کر جولیا تڑخ کر بولی: ''ایٹم بم تو روس اور چین نے بھی بنائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے پاس بھی یہ 'اسلامی بم' موجود ہے۔'' ہم پھر موضوع سے ہٹ رہے تھے' میں نے اپنی بات جاری رکھی: ''میرا سوال یہ ہے میں یا کوئی بھی شخص ارسطو' افلاطون' کانٹ' نیوٹن' آئن سٹائن کو بڑا دانشور' سائنسدان' فلسفی' مفکر نہیں مانتا' تو ایسے شخص کے بارے میں آپکی کیا رائے ہوگی؟'' میرے سوال کے جواب میں سب خاموش رہے' آخر فریڈرک نے ہی کہا: ''ہم ایسے شخص کو بے وقوف کہیں گے۔'' میں نے دریافت کیا: ''آخر کیوں؟ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں ان لوگوں کو بڑا اور عظیم تسلیم کروں؟'' بلراج نے میری بات آگے بڑھائی: ''بالفرض اگر یہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ان لوگوں کو بڑا عظیم دانشور' مفکر اور سکالر نہیں سمجھ رہا تو ہم کس بنیاد پر اسے بے وقوف قرار دے سکتے ہیں؟'' وہی برطانوی بولا: ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر ہم اسلام یا پیغمبر اسلام کو عظیم تسلیم نہیں کرتے تو تم ہمیں بے وقوف قرار دو گے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نینسی نے کہا: ''لیکن ارسطو سے لے کر آئن سٹائن تک آنے والے سب بڑے سائنسدان' مفکرین اور فلسفی غیر متنازعہ لوگ ہیں' اس کے برعکس پیغمبر اسلام ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔'' میں نے نینسی کی تائید کی۔ ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں' پیغمبر اسلام کو ایک متنازعہ شخصیت سمجھا جا رہا ہے' میں انہیں مثبت حیثیت کا مالک سمجھتا ہوں اور آپ لوگوں کے نزدیک ان کی تعلیمات منفی حیثیت رکھتی ہیں' ٹھیک ہے۔'' نینسی نے تائید میں سر ہلایا۔ ''میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ انسانیت

کی تاریخ کے سب سے ''بڑے انسان'' ہیں۔ میں اپنے اس نظریے کو ایک دعویٰ کی شکل میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔'' رابرٹ بولا: ''ہماری سوچ کیونکہ تمہارے اس دعویٰ کے خلاف ہے' اس لیے ہم اس پر بحث شروع کر دیں؟'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سونیا کماری پرسوچ انداز میں بولی: ''رابرٹ! تم نے رضا کی بات پر غور نہیں کیا۔'' باقی سب لوگوں سمیت میں اور رابرٹ بھی سونیا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''رضا نے ہم سے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جس طرح ہم ارسطو سے لے کر آئن سٹائن تک انسانی تاریخ کے بعض افراد کو ان کی حیثیت کے مطابق عظیم اور بڑا تسلیم کرتے ہیں' اسی طرح ہمارا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم پیغمبر اسلام کو بھی ان کے مرتبہ و مقام کے مطابق عظیم اور بڑا تسلیم کریں' اگرچہ ہم باقاعدہ طور پر ان کے مذہب کو اختیار نہیں کرتے۔'' جو بات میں واضح نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ سونیا نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کر دی تھی۔ ''اور کیونکہ ان کے بارے میں مختلف نوعیت کی آراء پائی جاتی ہیں' اس لیے ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ ان کے بارے میں ہماری رائے حقیقت سے کتنی قریب ہے؟'' سونیا نے مزید وضاحت کی تو وہی برطانوی پھر بولا: ''لیکن ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کے درست یا غلط ہونے کا جائزہ لیں؟ بطور خاص ایسی صورت میں جبکہ تمہارے بقول ہم نے ان کے مذہب کو قبول بھی نہیں کرنا ہے۔'' اس نے یہ سوال براہ راست سونیا ہی سے کیا تھا۔ ''تو پھر تم ایک مہربانی کرو' پیغمبر اسلام کا نام لیوا ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک بند کر دو۔'' سونیا نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اسے جواب دیا۔

بلراج نے سونیا کی تائید کرتے ہوئے کہا: ''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے' میرا رضا کے ساتھ تعلق صرف اس بنیاد پر ہے کہ ہم دونوں کی مادری زبان' لہجے کے معمولی سے فرق کے ساتھ ایک ہی ہے' حالانکہ ہم دونوں کا وطن مختلف ہے اور ایسا مختلف ہے کہ ان دونوں ممالک کے درمیان دو باقاعدہ جنگیں ہو چکی ہیں' لیکن اس وقت میں اس کا ساتھ اس لیے دوں گا کیوں کہ مجھے خود بعض اوقات اپنی داڑھی اور ایشیائی نقوش کی وجہ سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' بلراج کی بات پر پھر خاموشی چھا گئی' آخر رابرٹ نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: ''یہ بات واقعی غلط ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگ' جن میں' میں خود بھی شامل ہوں' اپنی نادانی کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کا رویہ اختیار کر جاتے ہیں' جو سماجی اخلاقیات کے اعتبار سے درست نہیں ہوتا۔'' بلراج نے جولیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ان محترمہ نے پوچھا تھا کہ امریکی کس ملک کے باشندوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں؟ میں ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ غلام سمجھنے کا یہ مطلب ہی نہیں ہوتا کہ آپ دوسرے شخص کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیں' اسے جلتی ہوئی بھٹی کے پاس کام کرنے کے لیے چھوڑ دیں' کسی بھی شخص کے ساتھ امتیازی سلوک' اس کی تحقیر کرنے' اسے غلام سمجھنے کے مترادف ہے۔'' تو یانگ نے کہا: ''اس حوالے سے کسی مذہب یا ملک کی کوئی خصوصیت نہیں ہے' امریکی مشرق سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو مشکوک سمجھتے ہیں۔''

یانگ کی یہ بات بھی اپنی جگہ درست تھی کیونکہ امریکہ میں رہنے والے' مختلف اقوام اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے ایشیائی افراد

کے خلاف مختلف اوقات میں نسلی فسادات ہوتے رہے ہیں۔ ان میں عربوں سے لے کر ویت نامی اور چینیوں تک سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ امریکہ میں بسنے والے چینیوں کی نسل کشی شروع ہو جائے گی' یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پچھلی ایک صدی کے دوران امریکہ نے بہت سی مشرقی اقوام کے خلاف مختلف اوقات میں مختلف محاذ کھولے' ان میں جاپان پر ایٹمی حملہ ویت نام کی جنگ سوویت یونین کا ٹوٹنا' لیبیا پر بمباری کوریا میں اثر و رسوخ میں اضافہ چین کے خلاف مختلف طرح کے داؤ پیچ وغیرہ بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ خود میرے اپنے وطن پاکستان کے ساتھ بھی امریکی پالیسی اس نوعیت کی رہی' جس کے نتیجے میں پاکستان کو مختلف طرح کے معاشی اور معاشرتی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ بلراج کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ کسی شخص کی تحقیر بھی اسے غلام سمجھنے کے مترادف ہے۔ میری نظر جولیا کی طرف اٹھی کہ شاید وہ ہی اس کا کوئی جواب دے۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رابرٹ بولا: ''تم کچھ جذباتی ہو رہے ہو۔'' تو بلراج نے اس سے پوچھا: ''پھر تم بتا دو کہ میں کہاں غلط ہوں''؟ رابرٹ نے کہا: ''امریکہ میں رہنے والا ہر امریکی بلکہ دنیا کی کسی بھی مہذب اور ترقی یافتہ ریاست کا کوئی بھی شہری اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ وہ مکمل امن اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرے''۔ نینسی نے اس کی بات کو آگے بڑھایا: ''اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ ریاست کے وجود کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشرے کے افراد پُرامن زندگی بسر کر سکیں۔'' اس کی بات کے جواب میں بلراج نے پوچھا: ''لیکن پُرامن زندگی میں دوسروں کی تحقیر کا کیا عمل دخل ہوگا؟'' تو رابرٹ نے ہی اسے جواب دیا: ''اگر کوئی گروپ اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے کسی ریاست کا امن تباہ کرنا چاہتا ہو اور کوئی مخصوص وضع قطع اسی گروپ کی علامتی شناخت ہو تو اب جو بھی شخص اس وضع قطع کو اختیار کرے گا' معاشرے کے افراد اس پر اپنا ردِ عمل ظاہر کریں گے۔'' جولیا نے اس کی مثال دیتے ہوئے ایک مرتبہ پھر ہم سب کو لاجواب کر دیا' وہ بولی: ''دیکھو بلراج! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر کوئی پاکستانی شخص پاکستانی لباس پہن کر انڈیا چلا جائے یا کوئی ہندوستانی شخص ہی پاکستانی لباس پہن کر باہر نکلے تو میں یہ نہیں کہتی کہ ہر جگہ لیکن بعض جگہوں پر اس شخص کو اس سے زیادہ ناگوار صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا' جس کا سامنا تمہیں امریکہ میں کرنا پڑا ہے۔'' رابرٹ نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا: ''اس کی دوسری مثال ہم یہ دے سکتے ہیں کہ پاکستان' افغانستان یا ان کی طرح کے کسی بھی اسلامی ملک میں اگر کوئی شخص کا مریڈوں کا مخصوص لباس پہن کر باہر نکلتا ہے تو عام افراد کا ردِ عمل کیا ہوگا؟'' ان کا یہ سوال اپنی جگہ پر ٹھیک تھا لیکن جولیا نے اس میں جو اضافہ کیا اس نے ایک لمحے کے لیے میرے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ وہ بولی: ''طالبان یعنی اسلامائزیشن کے دور میں تو غیر ملکیوں کو افغانستان میں مخصوص لباس پہننے کی ہدایت کی گئی تھی اور انہوں نے افغانستان میں موجود مہاتما بدھ کے تاریخی مجسموں کو بھی تباہ کر دیا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے بلراج کی طرف دیکھا اور بولی: ''میرے پیارے امریکہ میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا' ہر شخص خواہ اس کے پاس یہاں کی شہریت ہو یا وہ عارضی قیام کے لیے یہاں آیا ہو وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے رسم و رواج کے مطابق اپنی

زندگی گزار سکتا ہے۔'' اسی دوران فریڈرک ہولے سے کھکارا' میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے دور کی سوجھی ہے' اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: ''ایک بات بتاؤ! کیا ہم سعودی عرب' پاکستان یا افغانستان میں کوئی نائٹ کلب کھول سکتے ہیں؟'' سب کو اس کا جواب پتا تھا' اس لیے وہ سب مسکرانے لگے۔ میں نے جواب میں اس سے اُلٹا سوال کیا: ''کیا امریکہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے مسلمان طالب علم اور مختلف اداروں میں کام کرنے والے مسلمان کارکن طالبان کی طرح پگڑیاں باندھ کر وہاں آسکتے ہیں؟'' بلراج بولا: ''یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ امریکہ میں اظہار رائے کی تمام تر آزادی کے باوجود ایسا نہیں ہوسکتا۔ یونیورسٹیاں ایسے طلبہ کو باہر نکال دیں گی' تجارتی ادارے ایسے ملازمین کو برطرف کردیں گے۔'' میں نے پوچھا: ''اب تم ہی بتاؤ! ایسا کیوں ہوگا؟''

میرے سوال کے جواب میں فریڈرک کچھ دیر پُرسوچ انداز میں میری طرف دیکھتا رہا' پھر اس نے جولیا کی جانب دیکھا تو وہ بولی: ''ہمیں اس بارے میں پہلے رضا کا مؤقف سن لینا چاہیے۔'' میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اپنی بات شروع کی: ''میری بات غلط ہو سکتی ہے لیکن مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان اجتماعی طور پر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتا ہے' آپس کا یہ اختلاف ان کی فطرت کا حصہ ہے۔'' تو بلراج نے میری بات میں اضافہ کیا: ''اس اختلاف کا سبب مختلف ہو سکتا ہے جیسے مذہب' رنگ' نسل' جغرافیہ۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھی: ''معاشرے کے افراد کے اس باہمی اختلاف کے نقصانات سے بچنے کے لیے ریاست اور ریاستی ادارے وجود میں آئے۔'' جولیا نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا: ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مجھے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں کچھ دشواری محسوس ہو رہی تھی' لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی: ''یہ بھی ایک فطری حقیقت ہے' معاشرے کے مختلف افراد اور دنیا میں موجود مختلف ریاستوں کی پسند ناپسند' ترجیحات' مفادات' ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔'' تو رابرٹ نے میری بات کا جواب دیا: ''معاشرے کے افراد کے لیے مختلف ریاستی ادارے بنائے جاتے ہیں اور ریاستوں کے لیے یونائیٹڈ نیشن جیسے عالمی ادارے موجود ہیں۔'' یانگ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا' فوراً بولا: ''لیکن کیا وجہ ہے کہ یونائیٹڈ نیشن کے تمام بڑے فیصلوں کا اصل فائدہ امریکہ اور اس کی حامی ریاستوں کو ہوتا ہے۔ سری لنکا' مالدیپ' صومالیہ جیسے ملکوں کے حصے میں صحت اور ترقی میں معاونت کے نام پر صرف تھوڑی سی امداد آتی ہے''۔ رابرٹ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا' میں نے کہا: ''امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے' ریاستی سطح پر عوام کو جتنے بنیادی حقوق یہاں حاصل ہیں' دنیا کی بہت سی ریاستوں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' میرے بات ختم کرنے سے پہلے ہی بلراج درمیان میں بول پڑا: ''لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی بہت سی ریاستوں میں امریکہ مخالف جذبات کا پلڑا بھاری ہے' جن میں روس' چین اور مختلف مسلمان ممالک سرفہرست ہیں' میں نے کہا: ''اس وقت مسلمانوں کو امریکہ' امن اور تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جا رہا ہے۔'' جولیا نے کہا: ''آج کل تہذیبوں کے ٹکراؤ کا نظریہ بہت مقبول ہے۔'' بلراج نے مجھے مخاطب کیا: ''تہذیبوں کے ٹکراؤ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' میں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا: ''تہذیبوں کے اس ٹکراؤ میں دو فریق ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں' آزاد خیال لوگ اور قدامت پسند۔'' بلراج نے پھر سوال کیا: ''عام طور پر مسلمانوں کو قدامت پسند سمجھا جاتا ہے۔'' میں نے دریافت کیا: ''کیوں؟'' جولیا بولی: ''اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی آزادی کے سخت مخالف ہیں' یہاں تک کہ عورتوں کی مذہبی آزادی کے بھی مخالف ہیں' چند سال پہلے امریکہ میں ایک خاتون کو امام بنایا گیا تو مسلمانوں نے طوفان کھڑا کر دیا تھا۔'' میں نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور جواب دیا: ''مذاہب کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں' آج تک کوئی عورت پوپ یا کارڈینل نہیں بن سکی' بدھ مت' ہندومت'

عیسائیت اور اسلام سمیت دنیا بھر کے تمام مذاہب میں خواتین کو بنیادی مذہبی عہدے پر فائز نہیں کیا جاتا' یہ مذہب کی اپنی عمومی اخلاقیات ہیں۔''بلراج نے ایک نیا سوال اُٹھایا:''بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کچھ برسوں تک کوئی خاتون امریکہ کی صدر بن جائے گی لیکن آئندہ کئی برسوں تک کوئی بھی خاتون امریکی افواج کی چیف آف سٹاف نہیں بن سکتی۔''یانگ نے ایک اہم پہلو کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا: ''امریکہ کو آزاد ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا ہے' یہاں خواتین اور دیگر شہریوں کو جو حقوق حاصل ہیں' وہ ہمیشہ سے تو حاصل نہیں تھے۔''سونیا بولی:''آج سے 70 سال پہلے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔''وہی برطانوی شخص پھر بولا:''میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے اُٹھ جانا چاہیے' کیونکہ ہمیں یہاں اسلام پر بحث کرنے کے لیے کہا گیا تھا لیکن آپ لوگ گھما پھرا کر بات کو امریکیوں کے خلاف لے جاتے ہیں' اگر آپ کا موضوع بحث امریکیوں کی خامیاں ہے تو پھر مجھے اجازت دیں۔''یہ کہتے ہوئے اس نے کرسی کھسکائی اور اُٹھ کر چل دیا' اس کے ساتھ ہی وہ بیٹھک منتشر ہوئی' رابرٹ اور اس کے گروپ کے بقیہ افراد بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے جولیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:''میں تمہاری ذہانت اور معلومات سے متاثر ہوا ہوں' اگر تم بُرا نہ مناؤ تو کیا میں آئندہ تم سے رابطہ کر سکتا ہوں۔''بظاہر وہ فریڈرک کی دوست دکھائی دیتی تھی' جولیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فریڈرک نے کہا:''تم آئندہ رابطہ ہی نہیں اس سے شادی بھی کر سکتے ہو۔''میں نے جواب دیا:''تمہاری اس قدر دانی کا شکریہ' لیکن میں کسی امریکی عورت کے ساتھ شادی کرنے کا گناہ نہیں کر سکتا۔''میں نے لفظ گناہ پر زور دیتے ہوئے یہ بات کہی تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد میں نے ''ڈورتھی'' کو مخاطب کیا:''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمیں اتنا وقت دیا۔''پھر میں بلراج اور سونیا اکٹھے چلتے ہوئے کینٹین سے باہر آ گئے' میں نے بلراج سے اس کا پروگرام پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے کچھ دیر بعد کسی سے ملنے جانا تھا' میں نے خود بھی شام سات بجے پروفیسر نکلسن سے ملنے جانا تھا' اس لیے میں نے وہیں سے بلراج اور سونیا کو الوداع کہا اور اپنے ہوسٹل کی طرف چل پڑا۔ امریکی تعلیمی اداروں کا یہ دستور ہے کہ آپ دورانِ تعلیم جو مطالعہ کرتے ہیں' اس کے بارے میں مزید آگاہی حاصل کرنے' اپنا حاصل مطالعہ بیان کرنے کے لیے' اپنے کسی استاد کے ساتھ ہفتے میں ایک مرتبہ اس کے گھر میں دو تین گھنٹے کی نشست رکھتے ہیں' جس میں استاد اپنے شاگرد کو انفرادی توجہ کے ساتھ اس کے مضمون' مطالعے اور تحقیق سے متعلق مختلف گوشوں سے آگاہ کرتا ہے۔ ہوسٹل میں آ کر میں نے اپنی اسائنمنٹ کے صفحات اور مختلف نوٹس اکٹھے کیے اور شام کی ملاقات کی تیاری شروع کر دی۔

میرے استاد پروفیسر نکلسن' آکسفورڈ یونیورسٹی کے لاء گریجویٹ تھے' اس کے بعد انہوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی آف برکلے سے ایل۔ ایل۔ ایم اور بعد ازاں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کی۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی آف برکلے کا سکول آف لاء بین الاقوامی شہرت کا مالک ادارہ ہے' جہاں دنیا بھر سے بارہ سے پندرہ افراد کو ایل۔ ایل۔ ایم' یا پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا اہل سمجھ کر داخلہ دیا جاتا ہے۔ مغربی تعلیمی اداروں

میں برکلے کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔ پروفیسر نکلسن افریقہ کی نوآبادیوں میں ہونے والی قانون سازی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے بارے میں ریسرچ کا نگران تھا۔ اس ریسرچ میں' میرے حصے میں افریقہ کا اسلامی ملک تیونس آیا تھا' جو کسی زمانے میں ہالینڈ کی نوآبادی رہ چکا تھا۔ اس بدنصیب ملک کو آزاد ہوئے کئی دہائیاں گزر چکی تھیں لیکن اس کے باوجود یہاں عوام کے جمہوری حقوق کے حوالے سے کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پچھلے ایک ہفتے کے دوران اس موضوع پر جو ریسرچ کی تھی' شام کو پروفیسر نکلسن کے ساتھ اسی بارے میں نشست ہونا تھی' میرے دوسرے ساتھی جو اس پروجیکٹ کے دوسرے حصوں پر کام کر رہے تھے' ان میں سے بعض کے ذمے چند دیگر اسلامی ممالک کے بارے میں تحقیق کرنا لازم تھا۔ ان کے ساتھ گفت وشنید اور تبادلۂ خیال کر کے مجھے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ افریقہ کی زیادہ تر نوآبادیوں کا مہذب دنیا کے ساتھ صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ لوگ اب قتل وغارت گری کے لیے تلوار اور نیزے استعمال کرنے کی بجائے کلاشنکوف اور پستول استعمال کرتے ہیں' وہاں کے عام آدمی کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت آج بھی بھوک' بیماری اور غیر رسمی غلامی ہے۔ جانے انہیں متمدن دنیا تک پہنچنے میں ابھی اور کتنا عرصہ لگے گا' سیاہی صرف ان کے چہروں اور جسموں کا ہی نہیں' ان کے مقدر کا بھی نصیب سیاہی تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اہل یورپ کی ان سابقہ نوآبادیوں میں آج تک کوئی ایسا بڑا لیڈر پیدا ہی نہیں ہو سکا جو اپنے ملک کے عوام کو بنیادی حقوق کی فراہمی کی جدوجہد ہی کر سکے' ہر جگہ پر آمرانہ حکومتوں نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں' اور دنیا میں ان ریاستوں' یہاں کے شہریوں کی کوئی اوقات' کوئی حیثیت نہیں ہے' انہیں تیسرے بلکہ چوتھے درجے کا انسان سمجھا جاتا ہے۔

شام کو اپنے مقررہ وقت پر میں پروفیسر نکلسن سے ملا' اپنے مضمون سے متعلق ان سے استفادہ کرتا رہا' انہوں نے میری اسائنمنٹ پر سرسری نظر ڈالی' مطالعے کے دوران جو نوٹس میں نے تیار کیے تھے ان کا جائزہ لیا اور مجھے مفید مشوروں سے نوازا' وہاں سے اُٹھتے ہوئے میں نے پروفیسر نکلسن سے پوچھا: ''سر آپ کے علم میں کوئی ایسا محقق ہے جو مغرب اور اسلام کے باہمی اختلافات کے پیش منظر اور پس منظر سے متعلق حقائق سے آگاہ ہو اور اس حوالے سے میری کوئی راہنمائی کر سکے۔'' تو سر نکلسن بولے: ''ہاں! ایک شخص ایسا ہے کہ پروفیسر رابن پیریز وہ واشنگٹن ڈی سی یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبے میں وزیٹنگ پروفیسر ہے۔ مختلف تعلیمی ادارے' تھینک ٹینکس اس سے راہنمائی لیتے ہیں' میرے خیال میں وہ تمہارے لیے سودمند رہے گا''۔ میں نے سر نکلسن سے پروفیسر رابن پیریز کا نمبر لیا' جب میں وہاں سے اُٹھنے لگا تو پروفیسر نکلسن نے تنبیہ کے انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میرا تمہارے لیے مشورہ یہ ہے کہ تم اسلام' مسلمانوں اور اہل مغرب کے اختلاف میں پڑے بغیر اپنی مکمل توجہ اپنی پڑھائی کی طرف رکھو۔'' میں نے پروفیسر نکلسن کے اس ہمدردانہ مشورے کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اُٹھ کر ہوسٹل واپس آ گیا۔

اگلے دن میں یونیورسٹی آیا تو کلاسز کے درمیان وقفہ میں کیفے ٹیریا آ گیا' آج وہاں رابرٹ یا اس کے گروپ کا کوئی فرد نظر نہیں

آیا' وہاں بیٹھے ہوئے ایک شخص کا چہرہ کچھ شناسا سا محسوس ہوا تو میں نے سوچا شاید یہ شخص بھی کل ہماری ڈسکشن میں شریک ہوا تھا۔ لیکن اس نے باقاعدہ بحث میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میں نے شناسائی کے اظہار کے لیے اسے اشارہ کیا۔ میں ابھی کینٹین میں بیٹھا ہوا تھا' اسی دوران بلراج وہاں آ گیا' سونیا بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو سیدھا میری طرف آیا' رسمی سلام دعا کے بعد کہنے لگا: ''یار! میں تجھے ایک مشورہ دوں؟ یہ تبلیغ' دھرم پرچار یہ سب رشیوں' منیوں' مولویوں کا کام ہے' ہمارا تمہارا نہیں۔'' سونیا نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ''ہم کل یہ ڈسکس کر رہے تھے کہ آج کل پولیس مشکوک قسم کے افراد کو خواہ مخواہ گرفتار کر لیتی ہے اور پھر ایک طویل عدالتی تحقیقات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس کی وجہ سے تمہاری تعلیم کا سلسلہ کسی رکاوٹ کا شکار ہو جائے' ہم یہاں پردیس میں بیٹھے ہوئے ہیں' اگر پولیس ہمیں یا تمہیں پکڑ کے لے جاتی ہے تو نہ یہاں سے کوئی پوچھنے کے لیے آئے گا اور نہ ہمارے دیس سے کوئی ہمارا پتہ کرنے کے لیے آ سکتا ہے۔''

ان دونوں کی یہ بات ٹھیک تھی اور انہوں نے صرف میرے ساتھ دوستی اور ہمدردی کے جذبے کے تحت یہ بات کہی تھی' میں نے ان کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ آئندہ میں محتاط رہنے کی کوشش کروں گا' ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر بلراج نے بتایا کہ اس نے ایڈمنسٹریشن بلاک سے کوئی فارم لینا ہے' اس نے سونیا سے پوچھا کہ وہ اس کے ساتھ چلنا پسند کرے گی یا یہیں بیٹھنا چاہے گی؟ سونیا نے اس سے کہا کہ وہ اپنا کام نپٹا کے آ جائے۔ بلراج چلا گیا' اس کے جانے کے بعد سونیا مجھ سے میرے بارے میں' میرے گھر والوں کے بارے میں پوچھنے لگی' میں نے اسے مختصر طور پر اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں بتایا۔ اسی دوران شیشے کے پار سے ڈورتھی گزرتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے یہ خیال نہیں رہا کہ میں سونیا کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ میں ایک ٹک اسے دیکھنے لگا' میری نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کر کے شاید اس نے بھی مڑ کے دیکھا تو اس کی نظر ڈورتھی پر پڑی۔ عورتوں کو شاید بہت جلد اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا مرد کسی دوسری عورت میں دلچسپی لے رہا ہے' اس نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو میرا ارتکاز ٹوٹا' مجھے کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی' یوں جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔ سونیا میری اس حالت سے محظوظ ہوئی اور بولی: ''کوئی بھی عورت بڑے سے بڑے سادھو سنت کے دھرم اور پارسائی کو لمحوں میں بھرشٹ کر سکتی ہے' لیکن اپنے دھرم کی اَن دیکھی دیواروں میں قید عورت کے دل تک رسائی حاصل کرنا مردوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔'' میں اس کی بات پر مسکرا دیا' لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''ان تلوں میں تیل نہیں ہے' میرا مشورہ مانو تو کہیں اور قسمت آزمائی کرو۔'' اس نے ناصحانہ لہجے میں کہا' مجھ سے چپ نہیں رہا گیا'' میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایشور نے مہیلاؤں کو یہ اختیار ہی نہیں دیا کہ وہ اپنے کسی پریمی کو نظر انداز کر سکیں۔'' میری اس بات پر اس نے دھیما سا قہقہہ لگایا اور بولی: ''اچھا ڈائیلاگ ہے! تمہارے منہ سے لفظ ''مہیلاؤں'' سن کر اچھا لگا۔'' اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے'

کچھ دیر بعد بلراج واپس آ گیا تو میں نے ان دونوں سے معذرت کی کہ میں نے اگلی کلاس لینی ہے' اس لیے مجھے جانا ہوگا۔ کیفے ٹیریا سے نکل کر میں کلاس روم میں آ گیا۔

اگلے چند دن روزمرہ کی روایتی تعلیمی مصروفیات میں گزر گئے' ایک دن کچھ تلاش کرتے ہوئے مجھے اپنی ایک کتاب میں سے وہ کارڈ ملا جس پر پروفیسر رابن پیریز کے دفتر کا نمبر تحریر تھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے پروفیسر رابن پیریز سے بھی ملنا ہے۔ میں نے اسی وقت وہ نمبر ڈائل کیا تو آپریٹر نے بتایا کہ پروفیسر رابن پیریز علالت کی وجہ سے چھٹی پر ہیں' میں نے ان کے رابطہ نمبر کے بارے میں دریافت کیا تو آپریٹر نے مجھے ان کا پرسنل نمبر دے دیا۔ میں نے اسی وقت اس نمبر پر رابطہ کیا تو دوسری طرف فون اُٹھانے والے شخص کی آواز بہت باریک تھی اور اس میں نحیف ہونے کا تاثر موجود تھا' میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں آپ سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر رابن پیریز نے جواب میں میری اس خواہش پر خوشی کا اظہار کیا اور یہ بتایا کہ ان کی علالت کی وجہ سے ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں فی الحال موقوف ہیں' تاہم اگر میں غیر رسمی طور پر ان سے تبادلہ خیال کرنا چاہوں تو ان سے مل سکتا ہوں' میں نے ان سے وقت لیا اور مقررہ دن ان کے ہاں پہنچ گیا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے دروازہ کھولا' اس نے لمبا سیاہ گاؤن پہنا ہوا تھا' میں نے اپنا تعارف کروایا تو اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی اور مجھے ساتھ لے کر پروفیسر رابن پیریز کے کمرے میں آ گئی۔ پروفیسر رابن پیریز روایتی عمر رسیدہ یہودیوں کی طرح دراز قد اور دُبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں اور بشرے سے ذہانت اور تجربہ جھلکتے تھے۔ میں نے رسمی طور پر اس کی خیریت دریافت کی اور اسے یہ بتایا کہ مجھے پروفیسر نکلسن نے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے مکمل کوشش کی کہ میری آواز اور جسمانی حرکات و سکنات سے عاجزی و انکساری ظاہر ہو کیونکہ میں اس بات سے آگاہ تھا' یہودی خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں اس لیے ان کے مزاج میں رعونت اور تکبر پائے جاتے ہیں اور یہ کوئی فلسفیانہ حقیقت نہیں ہے کہ ایسا مزاج رکھنے والا شخص اپنے مدمقابل کی عاجزی کی وجہ سے تسکین محسوس کرتا ہے۔ پروفیسر رابن پیریز نے بھی رسمی انداز میں مجھے اپنی بیماری کے متعلق بتایا اور پھر مجھ سے دریافت کیا کہ وہ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں مسلمانوں اور مغرب کے باہمی اختلافات کا پس منظر اور پیش منظر سمجھنے کے لیے ان کے علم اور تجربے سے روشنی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پروفیسر رابن پیریز نے مجھ سے میرے آبائی وطن کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ انہوں نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی اور دریافت کیا: ''اپنے مذہب کے بارے میں تمہاری معلومات کیا ہیں؟'' میں نے انہیں بتایا کہ اس بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے: ''مسلمانوں اور مغرب کے درمیان اختلاف کا پس منظر جاننے کے لیے اسلام یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ خدا نے اپنے جن

بندوں کو اپنا برگزیدہ قرار دیا' ان میں سب سے اہم ابراہیم ہیں۔ ابراہیم کو خدا نے دو بیٹے دیئے: اسماعیل اور اسحٰق۔ اسماعیل بڑا بیٹا تھا' جو ایک مصری عورت کے ہاں پیدا ہوا' وہ مصری عورت دراصل ابراہیم کی بیوی سارہ کی خادمہ تھی' بعد میں ابراہیم نے اپنی بیوی کے اصرار پر اس خادمہ کے ساتھ شادی کر لی تھی' اس کے چند برسوں بعد خدا نے ابراہیم کو دوسرا بیٹا دیا جس کا نام اسحاق تھا۔ یہ ابراہیم کی پہلی بیوی کی اولاد تھا۔ جو ابراہیم کی چچا زاد بھی تھی۔ مذہبی روایات کے مطابق ابراہیم نے اپنے بڑے بیٹے اسماعیل اور اس کی ماں یعنی اپنی دوسری بیوی کو ایک ویران صحرا میں چھوڑ دیا' یہ وہی جگہ تھی جہاں اس وقت مسلمانوں کا مقدس شہر مکہ آباد ہے۔ اور مسلمان وہاں جو حج کی مذہبی رسم ادا کرتے ہیں اس کا تعلق بھی مسلمانوں کے بقول ابراہیم' اسماعیل اور اس کی والدہ کی یاد سے ہے۔'' یہ سب باتیں میرے علم میں تھیں لیکن پروفیسر رابن پیریز کا بیان کرنے کا انداز بہت متاثر کن تھا' یوں جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کو الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہو۔ ''دوسری طرف ابراہیم کا دوسرا بیٹا اور اس کی ماں آخر دم تک ابراہیم کے ساتھ یروشلم میں رہے۔ وہیں ابراہیم کا انتقال ہوا' وہیں اسحٰق اور اس کی والدہ کا انتقال ہوا' یہ تینوں یروشلم میں دفن ہیں' موجودہ تمام عالمی مسائل کو سمجھنے کے لیے یہ نقطہ ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ اسحٰق کو بھی خدا نے دو بیٹے دیئے: عیص اور یعقوب' یہ یعقوب اسحٰق کے بعد نبی بنے' ان کا نام اسرائیل تھا اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی' ہم یہودی ان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے' مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی روایات کے مطابق ایک یہودی عورت کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا' وہ عورت شادی شدہ نہیں تھی' آج کے عیسائی یہ کہتے ہیں کہ وہ بچہ خدا کا بیٹا تھا جبکہ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ خدا نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں صرف اس ایک بچے کو معجزے کے طور پر باپ کے بغیر پیدا کیا' ماں کی نسبت سے وہ بچہ یہودی خاندان کا ایک فرد تھا لیکن جب اس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو یہودی مذہبی پیشواؤں نے اس کی مخالفت کی اور اسے سزائے موت دلوا دی۔ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ خدا نے اسے زندہ آسمان پر اٹھا لیا تھا اور وہ قیامت قائم ہونے سے پہلے دوبارہ اسی عمر میں دنیا میں آئے گا جس عمر میں اسے آسمان کی طرف اٹھایا گیا تھا۔ اس واقعے کے بارے میں بہت سی روایات اور کہانیاں ذکر کی گئی ہیں' لیکن ہمارے لیے جاننے کی اصل چیز یہ ہے کہ وہ بھی یروشلم کا رہنے والا تھا۔'' پروفیسر رابن پیریز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر رہا تھا اور مجھے یہ بات جان کر حیرت ہوئی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ''نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص پر بہت کم لوگ ایمان لائے لیکن اس کے دنیا سے چلے جانے کے ایک صدی بعد اس کا مذہب پھیلنا شروع ہوا' مسیح نے خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تھا یا اس کا نبی ہونے کا' اس بحث سے قطع نظر ایک بڑی آبادی نے انہیں خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا اور ان کے ماننے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا' یہ وہی مذہب ہے جسے آج عیسائیت کہا جاتا ہے۔ عیسائی مذہب کو جب سیاسی حمایت اور ریاستی اثر و رسوخ حاصل ہوا تو ان لوگوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔'' پروفیسر رابن پیریز نے اپنی داستان درمیان میں روک کے میری طرف غور سے دیکھا اور بولے: ''موجودہ عالمی حالات کا پس

منظر سمجھنے کے لیے یہ نقطہ ذہن نشین رکھنا بہت ضروری ہے کہ یروشلم درحقیقت موجودہ یہودیوں کے آباء واجداد کی سرزمین ہے۔‘‘میں نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی‘ یہ تو طے تھا کہ پروفیسر رابن پیریز مجھے یہودیت اختیار کرنے کی دعوت نہیں دے سکتا‘ لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ ہر معاملے میں یہودیوں کی فضیلت کا اظہار کیوں کر رہا ہے‘ کیونکہ اس نے سب سے پہلے یہ نقطہ اُٹھایا کہ حضرت اسحٰق آخری دم تک حضرت ابراہیم کے ساتھ رہے‘ پھر یہ بات اُجاگر کی کہ حضرت اسحٰق کی والدہ حضرت ابراہیم کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں‘ اس کے برعکس حضرت اسماعیل کی والدہ کا تعلق دوسری قوم سے تھا اور اب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ جس انداز میں کر رہا تھا‘ اس سے یہ لگتا تھا جیسے یہودی خاندان کے کسی نوجوان نے اپنے بڑوں کے خلاف بغاوت کر دی ہو‘ اسی وقت میرے ذہن میں آیا کہ پروفیسر رابن پیریز کا موضوع کیونکہ بین الاقوامی تعلقات کے تاریخی پس منظر کی وضاحت کرنا ہے‘ اس لیے اس نے یہودیوں کی برتری ثابت کرنے اور اپنے سامعین کو متاثر کرنے کے لیے یہ چند ایک نکات اکٹھے کیے ہوئے تھے۔ پروفیسر رابن پیریز نے اپنا بیان جاری رکھا:’’اگلی تین چار صدیوں میں عیسائیت کی تعلیمات ان علاقوں میں زیادہ پھیل گئیں جو ہماری موجودہ دنیا کے اعتبار سے شام‘ ترکی اور یورپ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس دوران یہودیوں کے مختلف خاندان مختلف علاقوں میں پھیل گئے‘ ان میں سے کچھ خاندان موجودہ شام سے ہوتے ہوئے موجودہ سعودی عرب کے اس حصے میں آ کر آباد ہوئے جو مسلمانوں کے دوسرے بڑے مذہبی شہر مدینہ سے شام کی سرحد تک ہے۔‘‘ یا تو پروفیسر رابن پیریز خود اس بات سے واقف نہ تھا یا پھر اس نے اپنی کمزوری چھپانے کے لیے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہودیوں کے وہ خاندان وہاں آ کر کیوں آباد ہوئے تھے کیونکہ ہم نے تو اپنے علماء سے یہ بات سن رکھی ہے کہ وہ سب یہودی نبی آخرالزمان کی بعثت کے انتظار میں وہاں آباد ہوئے تھے‘ کیونکہ یہودیوں کی مذہبی روایات میں یہ بات مذکور تھی کہ نبی آخرالزمان کا ظہور اسی خطے میں ہوگا‘ لیکن جب ان کا ظہور ہوا اور یہودیوں نے دیکھا کہ وہ نبی بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو ان یہودیوں نے بغض وعناد کی وجہ سے اس آخری نبی کی تکذیب کر دی‘ جن کی بعثت کے انتظار میں ان کے آباء واجداد اپنا آبائی وطن چھوڑ کر عرب کی سرزمین پر منتقل ہوئے تھے۔’’مسیح کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے کم وبیش چھ سو سال بعد پیغمبر اسلام نے مکہ میں اعلانِ نبوت کر دیا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ ابراہیم کے بڑے بیٹے اسماعیل کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے اور وہ خدا کے سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ برگزیدہ بندے ہیں‘ وہ سب سے آخری نبی ہیں‘ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔‘‘ پروفیسر رابن پیریز کے الفاظ کا انتخاب اور مسلمانوں کے عقیدے کا اجمالی بیان قابل داد تھا‘ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کے سامنے صرف ایک مسلمان بیٹھا ہوا ہے۔’’آپ کیا سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا یہ دعویٰ درست تھا؟‘‘ میں نے پروفیسر رابن پیریز سے سوال کیا تو وہ ایک لمحے کے لیے شپٹا گیا۔ لیکن پھر اس نے جواب دیا:’’یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات کے مطابق ان کا یہ دعویٰ درست نہیں تھا جب کہ مسلمان اسے درست سمجھتے ہیں۔‘‘ میں نے

دل ہی دل میں اس کی مکاری کی داد دی کہ اس نے دفتر خارجہ کے کسی گھاگ اور تجربہ کار ترجمان کی طرح ایسا بیان دیا تھا جس سے اس کا مدعا بھی واضح ہو گیا اور دوسروں کے ساتھ تعلقات پر بھی کوئی آنچ نہیں آئی۔ پروفیسر رابن پیریز نے اپنی بات جاری رکھی: ''تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ یروشلم میں بسنے والے مسیح کے چھ سو سال بعد عرب کی سرزمین پر پیغمبر اسلام نے اعلانِ نبوت کر دیا۔ مسلمانوں کے مقدس مذہبی شہر مکہ میں بتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ پیغمبر اسلام کے اس اعلان کے نتیجے میں انہیں مکہ بلکہ تمام عربوں کی بھرپور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پیغمبر کی تعلیمات ان عربوں کے رسم و رواج اور ان کے آباء و اجداد کے عقیدے کے خلاف تھیں۔''

میں نے انگلی سے اشارہ کر کے ایک سوال کرنے کی اجازت چاہی تو جواب میں پروفیسر رابن پیریز نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیمات عمومی طور پر رائج رسم و رواج اور نظریات کے خلاف تھیں۔'' پروفیسر نے میری بات کی تائید میں سر ہلایا اور بولا: ''اسلام کے نظریے کے مطابق پیغمبر کوئی پہلے نبی نہیں ہیں۔ ان سے پہلے جو دوسرے انبیاء آئے' ان کی تعلیمات بھی عام معاشرتی نظریات کے خلاف تھیں۔'' پروفیسر نے بڑی صاف گوئی سے یہ اعتراف کیا تھا' میں نے اسے مزید کریدا: ''بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے انبیاء کے متعلق بھی آپ کی یہی رائے ہے؟'' اس نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا: ''خدا کے برگزیدہ ابراہیم جس معاشرے میں مبعوث ہوئے تھے' وہاں بھی بت پرستی کی رسم تھی اور ابراہیم نے اس کی مخالفت بھی کی۔ تو اس حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب انسانی معاشروں میں خدا کے حکم کے خلاف نظریات اور رسم و رواج پھیل جاتے ہیں تو پھر خدا کے حکم کے تحت اس کے پیغمبر لوگوں کی اصلاح کے لیے آ جاتے ہیں۔'' پروفیسر کی یہ بات سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں کسی عمر رسیدہ تجربہ کار یہودی دانش ور کی بجائے اپنے آبائی علاقے کی مسجد کے امام کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں کیونکہ ہم نے اپنے امام مسجد کی زبانی بھی اسی طرح کی باتیں سن رکھی تھیں اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ آسمانی مذاہب میں بہت سے نکات مشترک ہیں' لیکن مخصوص مفادات کے تحت ان مشترکہ نکات کو اجاگر نہیں کیا جاتا بلکہ ہمیشہ اختلافی مسائل کو ہوا دی جاتی ہے اور اس کے ذریعے باہمی منافرت پھیلائی جاتی ہے۔ میں نے اسی وقت ایک فوری خیال کے تحت پروفیسر سے سوال کیا: ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ امریکی معاشرہ کے رسم و رواج اور نظریات خدا کے احکامات کے مطابق ہیں' اگر نہیں تو انہیں ٹھیک کرنے کے لیے کوئی پیغمبر کیوں نہیں آیا؟ کیا ہمیں اس کا یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ پیغمبر اسلام کا یہ دعویٰ درست ہے کہ وہ آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔''

پروفیسر رابن پیریز نے میرے سوال کے جواب میں غور سے میری جانب دیکھا اور بولا: ''میں بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کا استاد ہوں' میں کوئی مذہبی پیشوا نہیں ہوں' اس لیے میں اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔'' اس نے چالاکی سے ایک مرتبہ پھر پینترا بدلا تھا۔

میں نے اسے زچ کرنے کے لیے کہا: ''میں مذہبی پیشوا کے طور پر نہیں بلکہ ایک دانشور کے طور پر اس بارے میں آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔'' اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور بولا: ''مذہب ایک ایسا موضوع ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی' جذباتی وابستگی سے متعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں زیادہ تر لوگ صحیح اور غلط کی پرواہ کیے بغیر صرف اپنی ذاتی وابستگی کو سامنے رکھ کر رائے دیتے ہیں۔ میں بھی ایک انسان ہوں' میرا یہ خیال ہے کہ میں اس حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے اپنے مذہب کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کی وجہ سے غیر جانبدار نہیں رہ سکوں گا اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ میرا جواب سن کر تم بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکو گے۔'' اس نے امریکیوں کی روایتی بے تکلفی اور پڑھے لکھے افراد کی مخصوص منطقی رسائی کو ملا کر مجھے لاجواب کرنے کی کوشش کی اور میں چند لمحوں کے لیے واقعی کنفیوژ ہو گیا' اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ کا کام کرنے والے شخص کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اس کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ ہر طرح کے لوگوں' ان کے سوالات' ان کی طرف سے اُٹھائے گئے اعتراضات کا سامنا کر سکتا ہو اور اس میں اپنے مدمقابل کو لاجواب کرنے کی بہترین صلاحیت ہونی چاہیے' جبکہ میری صورتِ حال یہ ہے کہ میں ایک عام مسلمان ہوں' جس کی اپنے مذہب کے بارے میں معلومات واجبی سی ہیں۔ میں اپنی گفتگو اور دعوت کے نتیجے میں ایک یا دو آدمیوں کو قائل کر لوں گا' لیکن زیادہ تر افراد کے سامنے مجھے لاجواب ہونا پڑے گا۔ بطورِ خاص اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے والے شخص کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ تقابل ادیان کے مضمون کا ماہر ہو' لیکن اگر ہم اس چیز کو شرط قرار دیں تو یہ بات اسلام کے عمومی مزاج اور تعلیمات کے خلاف ہو گی۔ ویسے بھی آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ دین کی تبلیغ کا فریضہ صرف انہی لوگوں نے سرانجام دیا ہے جو انتہائی صاحبِ علم تھے۔ میں نے پروفیسر رابن سے سوال کیا: ''لیکن مذہب کا بنیادی مقصد تو حق کی طرف رہنمائی ہوتا ہے کہ اگر مذہب نے بھی انسان کو صرف جذباتی وابستگی سکھانی ہے تو پھر اسے انسانی معاشرے سے نکال دینا چاہیے۔'' مختصر سے غور و فکر کے بعد آخر کار مجھے یہ سوال سوجھ ہی گیا' میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ تمہاری گفتگو سے تو یہ لگتا ہے کہ مذہب انسان کو صرف جذباتیت سکھاتا ہے' اس کا بالواسطہ مطلب یہ ہے کہ اپنی عمومی اثر انگیزی کے حوالے سے مذہب کا بنیادی تاثر منفی ہوتا ہے' تو پھر تم کیوں مذہب کو گلے لگائے بیٹھے ہو؟ میرے اس سوال کے جواب میں پروفیسر تھوڑی دیر خاموش رہا' پھر وہ بولا: ''دنیا کی سب سے اہم چیز انسان ہے' مذہب بنیادی طور پر انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو

قانون کے مطابق گزارنے کی تعلیم دیتا ہے لیکن انسانوں کی اجتماعی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ وہ لوگ مختلف ذہنی سطح اور مختلف جذباتی رویوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنی دنیا مختلف ریاستوں اور ممالک کی شکل میں تقسیم نظر آتی ہے۔ جہاں کے رسم ورواج اور تہذیب وتمدن ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا یہ اختلاف جب مذہب کا سہارا لیتا ہے تو وہاں سے لڑائی اور جنگوں کا آغاز ہوجاتا ہے۔ لیکن تم یہ دیکھو کہ دنیا کے تمام افراد مذہب کو ڈھال بنا کر ہاتھ میں تلوار پکڑ کے دوسروں کے خلاف کھڑے نہیں ہوجاتے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اصل بنیاد کے اعتبار سے مذہب لوگوں کے درمیان تفریق پیدا نہیں کرتا۔ لڑنے بھڑنے کے شوقین چند افراد مذہب کا سہارا لے کر اپنی فطرت کو تسکین پہنچاتے ہیں۔'' پروفیسر کا طویل کلام ختم ہوا تو میں نے سوال داغ دیا: ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ معاشرے اور ریاست کو سیکولر کردینے سے مذہبی منافرت ختم ہوجاتی ہے؟'' میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ سمیت دنیا کے بیشتر مغربی ممالک کو سیکولر ریاست کہا جاتا ہے' لیکن اس کے باوجود ان علاقوں میں مذہبی منافرت زیادہ پائی جاتی ہے۔ پروفیسر بولا: ''پہلی بات یہ ہے کہ سیکولر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ لوگ لادین ہوجائیں۔ سیکولر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی معاشرتی زندگی کو مذہب کی زنجیروں کی قید سے نجات دلائی جائے۔ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک کسی نہ کسی مذہب سے ضرور وابستہ ہوتا ہے' اسی لیے یہ کہنا مشکل ہوگا کہ سیکولرازم مذہبی منافرت کے خاتمے کا باعث بن سکتا ہے۔'' پروفیسر رابن نے میرے سوال کا بظاہر گول مول جواب دیا تھا' لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا یہ جواب اس کے پیشے کے ساتھ بالکل مطابقت رکھتا تھا۔ اس نے مذہب کو بھی دیوار کے ساتھ نہیں لگایا اور سیکولرازم کو بھی مکمل طور پر غلط قرار نہیں دیا' کیونکہ اس کے سننے والوں کے حلقے میں دونوں نظریات کے قائلین پائے جاتے ہیں۔ ''بہرحال یہودیت' عیسائیت اور اسلام تینوں آسمانی مذہب ہیں۔''

پھر وہ بات کو واپس اسی نقطے پر لے گیا' جو وہ بیان کرنا چاہ رہا تھا: ''پیغمبر اسلام کا یہ دعویٰ تھا کہ نبی کے مرتبے پر فائز ہونے کے حوالے سے بنی اسرائیل کے تمام انبیاء ان کے قریبی ہیں' اگرچہ جغرافیے' نسل اور زبان کے اعتبار سے ان کے درمیان فرق ہے' لیکن بہرحال پیغمبر اسلام کی طرح وہ بھی خدا کے برگزیدہ ابراہیم کی اولاد ہیں' اس حوالے سے پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ پیغمبر کے آبائی شہر مکہ اور اقامتی شہر مدینہ کے بعد مسلمانوں کے لیے تیسرا بڑا مقدس مذہبی شہر یروشلم ہے۔'' پروفیسر رابن پیریز واقعی ایک استاد تھا' ایک چالاک اور مکار یہودی' اس نے بڑی فنکاری کے ساتھ یہ پس منظر بیان کرتے ہوئے بین السطور میں یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان خواہ مخواہ بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ ان کے پیغمبر کے نزدیک یہ تیسرے درجے کا مذہبی شہر ہے' تو مسلمانوں کی بہ نسبت عیسائیوں کا حق زیادہ بنتا ہے' کیونکہ وہ اسے درجہ اوّل دیتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ یہودیوں کا حق ہے' جن کے حقیقی آباء واجداد کی یہ سرزمین ہے۔'' پیغمبر کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے چند برس بعد ہی مسلمانوں کی فوج یروشلم

کے دروازے پر دستک دے رہی تھی' جو اس وقت عیسائیوں کے قبضے میں تھا' یہ دوسرے خلیفہ عمر کے عہد حکومت کی بات ہے' انہوں نے ایک طرف عربوں کے ایک پڑوسی' یعنی ایرانی سلطنت کو شکست دے کر اسے اسلامی حکومت کے زیرنگین کر دیا اور دوسری طرف یروشلم کے گردونواح میں موجود عیسائی ریاست کے تمام علاقے فتح کر کے آخرکار یروشلم پر بھی قبضہ کیا' پھر مسلمانوں نے قبضہ کیا' پھر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور پھر مسلمانوں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا' آخرکار گزشتہ صدی میں صدیوں کی جدوجہد کے بعد یہودیوں نے یہاں اپنی ریاست قائم کی جسے اسرائیل کا نام دیا گیا۔'' پروفیسر رابن پیریز کا طویل بیان ختم ہوا تو اس نے آواز دی جس کے جواب میں وہی عمر رسیدہ خاتون کمرے میں آئی' جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا' میں اسے پروفیسر رابن پیریز کی بیوی سمجھا تھا' لیکن پروفیسر نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کی بہن تھی' پروفیسر نے اسے کافی لانے کے لیے کہا' اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے دوبارہ سلسلہ کلام شروع کیا: ''اگر تم پچھلی ایک ڈیڑھ صدی کے عالمی حالات کا جائزہ لو تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اس دوران دنیا کے بیشتر حصے مختلف عیسائی ریاستوں کی نوآبادی تھے' اس دوران کمیونزم کے نام پر ایک نئی تحریک چلی' جس نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو متاثر کیا' اسی دوران مسلمانوں کی ایک بڑی مرکزی حکومت سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور یہ سلطنت مختلف چھوٹی ریاستوں کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی' اسی دوران یہودیوں کی عالمی نسل کشی کا آغاز ہوا' جس کے نتیجے میں بہت سے یہودیوں کی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں' اس وقت بیشتر یہودی اپنے آبائی علاقوں کو چھوڑ کر امریکہ منتقل ہو گئے' یہی وہ وقت تھا جب عیسائی ریاستوں کے نوآبادی علاقوں میں آزادی کی تحریکیں چلیں اور یہ ریاستیں سمٹتے ہوئے ایک مخصوص خطے تک محدود ہو کر رہ گئیں' یہی وہ وقت تھا جب امریکہ کے بین الاقوامی اثر و رسوخ میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایجادات کی رفتار سابقہ تمام زمانوں سے کئی گنا زیادہ ہو گئی۔'' پروفیسر رابن پیریز کا یہ بیان بالکل درست تھا کیونکہ سابقہ ایک صدی کے دوران ایجادات کی جو شرح ہے وہ پچھلی تمام صدیوں کی مجموعی ایجادات کی شرح سے زیادہ ہے اور ان ایجادات نے دنیا کو سمیٹ کر ایک گلوبل ویلج کی شکل دے دی ہے۔

''آج جب میں غور کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خداوند نے ان تمام چیزوں کو ایک ساتھ ایک ہی موقع پر اس لیے اکٹھا کیا تاکہ مملکت اسرائیل وجود میں آنے کے بعد اپنی بقاء کو قائم بھی رکھ سکے۔'' مجھے پروفیسر کی اس بات پر تاؤ آ گیا' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے دریافت کیا: ''آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں اور مغرب کے درمیان تصادم کی بنیادی وجہ مملکت اسرائیل کی بقاء ہے؟'' پروفیسر میری بات سن کر مسکرا دیا اور بولا: ''تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ مملکت اسرائیل کو نیست و نابود کر دیں تو کیا وہ اسے چھوڑ دیں گے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا' تو اس نے اگلا سوال یہ کیا: ''تم کیا سمجھتے ہو کہ یہودیوں کو اپنی ریاست کی بقاء کی جدوجہد نہیں کرنی چاہیے؟'' میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا: ''انہیں ضرور ایسا کرنا چاہیے۔'' اگرچہ دل سے

میری بھی یہی خواہش تھی کہ اسرائیلی ریاست ختم ہو جائے اور فلسطین آزاد ہو جائے لیکن میں اس وقت یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا۔ ''اس وقت مغرب اور عالم اسلام ایک دوسرے کے مقابل محسوس ہوتے ہیں اس کے پس منظر میں اور بھی بہت سے نکات ہیں' جن میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اگر مسلمان ممالک اپنے دوسرے ہمدردوں کے ساتھ مل کر اپنا ایک الگ بلاک بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں اقوامِ مغرب کی معیشت بُری طرح متاثر ہو جائے گی۔ ایک اس حوالے سے کہ دنیا کے ایک بڑے حصے کو توانائی کا اصل ذریعہ یعنی تیل زیادہ تر اسلامی ممالک کی طرف سے سپلائی کیا جاتا ہے' اگر یہ سپلائی منقطع ہو جائے تو باقی دنیا بطورِ خاص مغربی ممالک کے ذرائع نقل وحمل متاثر ہو جائیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ امریکہ کی ایک بڑی پیداوار جنگی اسلحہ ہے جس کے زیادہ تر خریدار مسلمان ممالک ہیں۔'' پروفیسر رابن پیریز کی یہ بات بالکل ٹھیک تھی کیونکہ تمام اسلامی ملک اپنے جنگی وسائل کے لیے امریکہ کے محتاج ہیں بلکہ بعض ممالک کی اپنی فوج تو برائے نام ہے' حقیقت میں وہ مکمل طور پر امریکی فوج کے رحم وکرم پر ہیں' اسی طرح امریکیوں نے اپنا اسلحہ فروخت کرنے کے لیے دو اسلامی ممالک یعنی ایران اور عراق کو ایک طویل عرصے تک ایک بیکار جنگ میں اُلجھائے رکھا اور جب وہ جنگ ختم ہوئی تو عراق کا کویت پر قبضہ کروا کر مشرقِ وسطیٰ میں اپنی افواج داخل کرنے کا راستہ ہموار کیا' میں نے پروفیسر رابن پیریز سے سوال کیا: ''امریکیوں کی اصل پالیسی کیا ہے؟'' پروفیسر رابن پیریز نے جواب دیا: ''امریکیوں کی اصل پالیسی کو آپ ایک جملے میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ انہیں بین الاقوامی سطح پر جو بالادستی حاصل ہے وہ برقرار رہے۔'' پروفیسر کا یہ جملہ اس کی ذہانت کا آئینہ دار تھا' واقعی اگر آپ دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف امریکی پالیسیوں کا جائزہ لیں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ پہلے وہ دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور اب وہ اس بالادستی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں وہ کوئی بھی حربہ اختیار کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے خواہ اس کے لیے انہیں آمرانہ حکومتوں کی پشت پناہی کرنا پڑے یا جمہوری تحریکوں کی حوصلہ افزائی کرنا پڑے۔ ''دنیا میں بالادستی قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور پھر اسے برقرار رکھنا اور بھی مشکل ہے' دنیا کی تمام ریاستیں شطرنج کے خانوں کی مانند ہیں اور وہاں کی حکومتیں مہروں کی حیثیت رکھتی ہیں' ان مہروں کو بڑی مہارت سے استعمال کیا جاتا ہے' ورنہ خود کو شہ مات ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔'' پروفیسر نے اچھی مثال دی تھی' اگر آپ سابقہ ایک صدی کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ امریکیوں کی چالیں اُلٹ گئیں ان کے مہرے پٹ گئے' لیکن ابھی تک ایسی کوئی علامت ظاہر نہیں ہو سکی کہ جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ اب امریکیوں کو شہ مات ہو جائے گی۔ میں نے پروفیسر سے سوال کیا: ''اس وقت امریکہ اور مغرب' اسلام اور مسلمانوں کے مدمقابل ہیں' آپ ان کے باہمی اختلاف کے بارے میں کیا کہتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟'' پروفیسر نے پرسوچ انداز میں جواب دیا: ''میرا یہ خیال ہے کہ مسلمان اور مغرب ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں ہیں۔'' پروفیسر کی اس بات پر میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا' کیونکہ اس کا یہ تبصرہ عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی جائزوں کے مکمل خلاف تھا۔

''تم یہ دیکھو کہ دنیا کے بیشتر بلکہ اکثر اسلامی ممالک کی حکومتیں امریکیوں کی دوست بلکہ ان کی وفادار ہیں' ان میں اسلامی بم رکھنے والے پاکستان سے لے کر یروشلم پر قبضے کے خواب دیکھنے والی فلسطینی ریاست کی اتھارٹی سب شامل ہیں' سعودی عرب کے شاہوں سے لے کر مصروشام کے صدور تک سب امریکہ کے بہترین حلیف ہیں۔'' اس کی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک تھی' خود پاکستان میں جتنی فوجی حکومتیں آئیں اورانہیں ختم کر کے جتنی جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں' ان سب کو واشنگٹن کی بھرپور آشیرباد حاصل تھی۔ ''لیکن زیادہ تر اسلامی ممالک میں عوام امریکہ مخالف جذبات رکھتے ہیں' اسکے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟'' پروفیسر میری اس بات پر مسکرا دیا' یوں جیسے میں نے کوئی بچگانہ بات کہہ دی ہو۔ ''باقی ملکوں کو تو رہنے دو' تم صرف اپنے ملک پاکستان کی تاریخ کا جائزہ لو' پچھلے پچاس سال کے دوران یہاں جتنے بھی امریکہ مخالف مظاہرے ہوئے ہیں' ان میں تمہیں صرف داڑھی والے لوگ نظر آئیں گے۔ چند ملاّ چند مذہبی سیاسی جماعتیں چند لوگوں کو اکٹھا کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پورے ملک میں امریکہ مخالف جذبات پائے جاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کون سی غیر مذہبی جماعت نے امریکہ مخالف کوئی بڑا مظاہرہ کیا ہو۔'' میں نے چند لمحے کے لیے سوچا لیکن میری یادداشت میں ایسے کسی مظاہرے کی یاد تازہ نہیں ہو سکی' جو کسی غیر مذہبی سیاسی جماعت کی طرف سے کیا گیا ہو۔ ''تم بُرا نہ ماننا لیکن سابقہ ایک صدی کے دوران اسلام مخالف قوتوں کو سب سے زیادہ فائدہ تمہارے مذہبی پیشواؤں نے پہنچایا ہے۔'' پروفیسر کی یہ بات سن کر مجھے اباجان کے چچا یاد گئے' جنہیں ہم ''چھوٹے ابوجی'' کہا کرتے تھے' وہ کسی زمانے میں کمیونسٹ تحریک کے سرگرم رکن رہے تھے اور ملاؤں کے بڑے مخالف تھے' وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ یہ ملاّ ہیں جنہوں نے قائداعظم کو کافراعظم قرار دیا تھا اور تقسیم ہند کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ یہ گاندھی اور نہرو کے وفادار بن گئے تھے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد انہوں نے خود کو اسلام کا عظیم مجاہد قرار دیا اور اسلام کے ان ہی عظیم مجاہدین نے بھٹو صاحب کے خلاف تحریک چلا کر امیرالمؤمنین جنرل محمد ضیاء الحق کے اقتدار کا راستہ ہموار کیا اور بھٹو صاحب کو تختہ دار تک پہنچا دیا' اس بھٹو کو جو امریکہ مخالف بلاک بنانا چاہتا تھا اور اس کا تمام تر فائدہ صرف امریکہ کو ہوا۔ پھر انہی مجاہدین نے امیرالمؤمنین کی زیر قیادت کرائے کے فوجیوں کے طور پر روس کے خلاف اور امریکہ کے مفاد میں طویل جنگ لڑی' جس نے دنیا بھر میں امریکی بالادستی قائم کرنے کا راستہ ہموار کیا' ایک لمحے میں یہ تمام باتیں میرے ذہن سے گزر گئیں' میں نے پروفیسر سے پوچھا: ''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ملاّ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔''

پروفیسر میرے سوال کے جواب میں تھوڑی دیر خاموش رہا' یوں جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے' ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا: ''مسلمانوں کے دو بڑے مقدس مذہبی شہر مکہ اور مدینہ سعودی عرب میں ہیں لیکن وہاں کوئی جہادی تحریک نہیں ہے' مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ الازہر یونیورسٹی' مصر میں ہے وہاں کے جہادی گروپوں کو مصری حکومت خود ہی نکیل ڈال چکی ہے۔ اوسط کے اعتبار سے اقلیت کے طور پر سب سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں' وہاں جہاد کا نعرہ بلند نہیں ہوتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا

بھر سے جہاد کے متوالے پاکستان کو اور پاکستان میں بھی ان علاقوں کو جو افغان سرحد کے قریب ہیں، یہ مجاہدین اس علاقے کو اپنے لیے جنت کیوں سمجھتے ہیں۔" پروفیسر کا یہ سوال بہت ٹیڑھا تھا، میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اور یہ بات حقیقت تھی کہ سعودی عرب اور مصر سمیت کسی بھی عرب ملک میں کوئی جہادی گروپ اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتا تھا، جبکہ پاکستان میں نہ صرف یہ کہ بہت سی جہادی تنظیمیں قائم تھیں بلکہ نئے آنے والے مجاہدین کی تربیت کا معقول انتظام بھی موجود تھا، ہمارے "چھوٹے ابوجی" کہا کرتے تھے کہ یہ تمام جہادی گروپ ایجنسیوں کے ٹاؤٹ ہیں، یہ سب ایجنسیوں سے پیسے لیتے ہیں، عام سادہ لوح مسلمان نوجوانوں کو تربیت دے کر شہید ہونے کے لیے محاذ پر بھیج دیتے ہیں اور خود اپنی پجارو، کلاشنکوف بردار گارڈ سمیت یہیں بیٹھے رہتے ہیں، ان شہداء کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنے کے لیے، ان قائدین میں سے کسی ایک نے اپنا کوئی بیٹا، اپنا کوئی بھائی جہاد میں شرکت کے لیے نہیں بھیجا ہوگا، یہ سب ایجنسیوں کے وفادار ہیں اور ایجنسیاں امریکی مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں۔ یہ سب بھاڑے کے ٹٹو ہیں اور چھوٹے ابوجی کی یہ بات اس وقت درست ثابت ہوئی، جب نائن الیون کے بعد فوجی قیادت نے جہاد کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچا تو اس کے بعد کوئی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھانے والا باقی نہ رہا۔

پروفیسر اپنی رو میں کہے جا رہا تھا: "یہ سب مجاہدین افغانستان کے مختلف وار لارڈز کے وفادار ہوتے ہیں، خواہ وہ طالبان ہوں یا ان کے مخالف شمالی اتحاد کے لوگ ہوں، ان مجاہدین نے افغانستان میں اتحادی افواج کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا ہوگا جتنا نقصان یہ ایک دوسرے کو پہنچا چکے ہیں۔" پروفیسر نے اپنی گفتگو میں توقف کیا تو میں یہ سوچنے لگا کہ اس جہاندیدہ یہودی دانش ور کی سب باتیں انتہائی تلخ ہونے کے باوجود حقیقت سے کتنی قریب ہیں اور ہمارا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ دنیا بھر میں بسنے والے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے پاس کوئی ایک بھی بین الاقوامی معیار کا دانش ور نہیں ہے۔ لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ اگر کوئی مسلمان دانش ور مسلمانوں کو یہ سب حقائق سمجھانے کی کوشش کرے تو اسلام کا کوئی پرجوش مجاہد اٹھ کر اسے گولی مار کر جہنم رسید کر دے گا اور خود غازی بن جائے گا، میں نے چند لمحوں میں پروفیسر رابن پیریز کی تمام گفتگو کو اپنے ذہن میں دُہرایا اور پھر اس سے سوال کیا: "آپ کیا سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور اس کے مخالف مجاہدین جو آپ کے بقول صرف چند مذہبی انتہاء پسند ہیں، ان دونوں میں سے کون کس حد تک ٹھیک ہے اور کہاں تک غلط ہے؟" میرے اس سوال کے جواب میں پروفیسر تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا: "میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جب مسلمان کسی معاملے میں بے بس ہو جاتے ہیں تو وہ یا تو اللہ کی رضا سمجھ کر خود کو تسلی دے دیتے ہیں یا پھر صحیح اور غلط کی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔" پروفیسر کی اس بات پر مجھے ہنسی آ گئی، اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ "جو لوگ صحیح اور غلط کی بحث چھیڑتے ہیں، وہ اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ ان کی یہ بحث ان کی ذاتی ترجیحات سے نہ ٹکرائے۔" اس کا یہ کہنا بھی بالکل ٹھیک تھا کیونکہ مجھے بھی پتہ تھا کہ مجھ سمیت امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے والے یا ان کے علاوہ امریکہ میں قیام پذیر تمام مسلمان صحیح اور غلط کی تحقیق یا تبلیغ کے نام پر ایسا کوئی خطرہ مول لینے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے، جس کے نتیجے میں امریکہ میں ان کا

عارضی یا مستقل قیام خطرے میں پڑ جاتا۔ میں نے خود ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو باریش اور پنج وقتہ نمازی ہوتے ہیں' ہر وقت تسبیح ہاتھ میں پھر رہی ہوتی ہے لیکن ان کا کاروبار سودی ہوتا ہے' ان کے نزدیک نماز نہ پڑھنا غلط ہوتا ہے' لیکن اپنے کاروبار کے بارے میں وہ صحیح اور غلط کی بحث میں نہیں پڑتے' اسی طرح کی دوسری بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں' جن کا روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر نے میری بات کا جو جواب دیا تھا' اس سے مجھے یہ لگا کہ شاید وہ بات گول کرنا چاہتا ہے' لیکن یہ میری غلط فہمی تھی' اس نے اپنی بات آگے بڑھائی: ''صحیح اور غلط مذہب کا موضوع ہے سیاست اور خاص طور پر بین الاقوامی تعلقات کا اپنا ضابطہ اخلاق ہوتا ہے' آپ اسے مذہب کے پیمانے پر جانچ نہیں سکتے اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو غلط کرتے ہیں۔'' مجھے اس کی یہ بات ہضم نہیں ہوئی لیکن میں خاموش رہا اور وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا: ''سیاست کا سب سے پہلا اور اہم بنیادی ضابطہ اپنے ذاتی مفاد کا حصول ہے' کوئی بھی ریاست صرف وہ پالیسی اختیار کرتی ہے' جو اس کے بہترین ذاتی مفاد میں ہو اور جس کے نتیجے میں اس ریاست کو کسی مشکل یا پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' عملی حقائق کے اعتبار سے اس کی یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی کیونکہ دنیا کے تمام اسلامی ممالک کی خارجہ پالیسی ان ملکوں کے اپنے مفاد کے گرد گھومتی تھی۔ جیسے مصر' اسرائیل کا حلیف ہے' اُردن کا بادشاہ اسرائیل کی سرزمین پر قتل ہوا تھا لیکن شام' اسرائیل کا مخالف ہے اور اس کی وجہ بھی اسلام اور یہودیت کا تصادم نہیں ہے بلکہ اس دشمنی کی اصل وجہ ایک چھوٹی سی سرحدی پٹی ہے جسے گولان کی پہاڑیاں کہا جاتا ہے' شام کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ ہمارا علاقہ ہے جبکہ اسرائیل نے اس علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میرے ان خیالات سے بے خبر پروفیسر رابن پیریز کہہ رہا تھا: ''وہ لوگ جو دنیا کے مختلف خطوں میں بستے ہیں اور امریکہ کی بہت سی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے ہیں' وہ یہ نقطہ فراموش کر دیتے ہیں کہ امریکہ یہ پالیسیاں اپنے مفاد کے لیے بناتا ہے اور اسے یہ پالیسیاں اپنے مفاد کے لیے ہی بنانا چاہئیں۔'' پروفیسر نے ان دو جملوں کے ذریعے میری آدھی اُلجھن ختم کر دی تھی۔ واقعی اگر ہم اس حقیقت کا ادراک کر لیں کہ امریکہ ایک ریاست ہے' اس کے اپنے مفادات ہیں اور اس نے ان مفادات کے مطابق اپنی پالیسی بنانا ہے تو ہمیں امریکہ سے بہت سی شکایات ختم ہو جائیں گی' یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہمارے پاکستان میں بعض مذہبی قائدین اپنے ذاتی مفاد کے لیے کبھی آمریت کو سہارا دیتے ہیں اور کبھی جمہوریت کے گن گا رہے ہوتے ہیں۔ ''پروفیسر صاحب آپ نے میری ایک بڑی اُلجھن ختم کر دی لیکن دوسرا سوال ابھی باقی ہے' اس جنگ کے دوسرے فریق مسلمانوں میں کیا خامیاں پائی جاتی ہیں؟'' پروفیسر میرے اس سوال کے جواب میں خاموش ہو گیا' شاید اس وجہ سے کہ میں بھی ایک مسلمان ہوں' میری اپنے مذہب کے ساتھ ایک وابستگی تھی' اسے اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ جواب دیتے ہوئے وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے میرے جذبات مجروح ہوں' شاید اسے یہ اندیشہ بھی ہو کہ میں اس کی کسی بات پر مشتعل بھی نہ ہو جاؤں' اس مرتبہ اس کی خاموشی کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا اور بولا: ''یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت امریکہ کی مخالف

نہیں ہے۔صرف ایک یا دو فیصد لوگ ایسے ہیں جو امریکہ کے بارے میں مخاصمانہ جذبات رکھتے ہیں' اور یہ بھی وہ لوگ ہیں جو مختلف جہادی تنظیموں سے وابستہ ہوتے ہیں' ایسے لوگ دن میں یہ خواب دیکھتے ہیں کہ وہ امریکہ کو تباہ و برباد کر دیں گے' ہمارے پاس ان جہادی تنظیموں کی طرف سے پرنٹ ہونے والے اخبار و جرائد کے بارے میں جو رپورٹس آتی ہیں' ان میں سے زیادہ تر میں یہی تحریر ہوتا ہے کہ امریکہ عنقریب تباہ ہو جائے گا۔وہ اتنے ارب ڈالر کا مقروض ہو چکا ہے' اس کی معیشت ختم ہو جائے گی' وہاں زلزلے اور طوفان آئیں گے' یہ سب باتیں کس قسم کی اجتماعی نفسیات کی عکاسی کرتی ہیں؟'' پروفیسر نے میری جانب سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تو میں نے لمحے بھر کے لیے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے جواب دیا: ''شاید ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب خدا ہی امریکہ کو تباہ و برباد کرے تو کرے' ہم کچھ نہیں کر سکتے۔'' پروفیسر میری بات پر مسکرا دیا۔''تم کیا سمجھتے ہو کہ خدا کو امریکہ کو برباد کر دینا چاہیے؟'' اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے اپنے ضمیر سے یہی سوال کیا تو جواب نفی میں تھا۔''اگر میں خدا ہوتا تو امریکہ کو ہرگز نہ برباد کرتا۔'' میرے جملے پر پروفیسر کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور وہ بولا: ''یہی وجہ ہے کہ خدا نے بھی امریکہ کو برباد نہیں کیا اور کرے گا بھی نہیں۔''

پروفیسر رابن پیریز کا یہ جملہ مجھے پسند نہیں آیا۔ ''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خدا امریکہ کو برباد نہیں کرے گا۔'' پروفیسر کا جواب میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ ''اگر تم خدا ہوتے تو امریکہ کو کیوں برباد نہ کرتے؟'' اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ میں نے لمحے بھر کے لیے سوچا اور پھر جواب دیا: ''تین وجوہات کی بناء پر کیلیفورنیا یونیورسٹی آف برکلے، بل گیٹس اور ہالی وڈ۔'' پروفیسر میری بات سن کے کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا: ''مجھے اس بارے میں شک ہے کہ تم مسلمان ہو۔'' میں نے بھی اس کی بات کے جواب میں نیم مزاحیہ انداز میں کہا: ''میں امریکی آئین کی کتاب اور توراتِ مقدس سمیت کسی بھی کتاب پر ہاتھ رکھ کر یہ حلفیہ بیان دے سکتا ہوں کہ میں واقعی مسلمان ہوں۔'' آخری جملہ میں نے کچھ جذباتی انداز میں کہا۔ ''اگر تم واقعی مسلمان ہو تو امریکہ کو اصل خطرہ جہادی مسلمانوں کی بجائے تم جیسے مسلمانوں سے ہوگا، جو ہالی وڈ کی وجہ سے امریکی بقاء کو ضروری سمجھتے ہیں۔'' پروفیسر کی یہ بات مجھے سمجھ نہ آئی، میرے چہرے پر موجود اُلجھن کا تاثر دیکھ کر اس نے دریافت کیا: ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے ہالی وڈ کا ذکر کیوں کیا؟'' اس کے اس سوال پر مجھے چند برس پہلے کا واقعہ یاد آ گیا، جب ہم چند دوستوں نے مل کر ایک ساتھ بیٹھ کر اس وقت کی مقبول فلم ''ڈے آفٹر ٹومارو'' دیکھی تھی، فلم ختم ہونے کے بعد ہمارے ایک دوست نے یہ کہا تھا کہ ہم امریکیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، فلم تفریح کا ذریعہ ہے لیکن انہوں نے تفریح کا یہ ذریعہ فراہم کرنے کے لیے اتنی بھرپور محنت کی ہے کہ تمام تر جزئیات کا خیال رکھا ہے، کہیں بھی جھول نہیں آنے دیا اور ایک ایسی صورتِ حال کو جس کا رونما ہونا بظاہر ممکن نہیں ہے، اسے حقیقی شکل میں سینما سکرین پر پیش کر دیا ہے تو جو لوگ تفریح کے کاموں میں اتنی محنت کرتے ہیں، وہ عام حقیقی زندگی میں کتنا اہتمام کرتے ہوں گے، جبکہ ہم مسلمان تو بظاہر آئندہ کئی برسوں تک اتنی محنت کرنے کے لیے تیار ہوتے نظر نہیں آتے، میں نے یہی بات پروفیسر کے سامنے دُہرا دی تو وہ بولا: ''تمہاری اس بات میں سچائی تسلیم کرنے کا پہلو پایا جاتا ہے لیکن یہ بچگانہ سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ پختگی کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہ کہوں جب تک امریکہ کا تعلیمی نظام مضبوط ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں بہتری لانے کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک امریکہ کی عدالتیں آزادانہ طور پر عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق فیصلے کر رہی ہیں، اس وقت تک امریکہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔''

پروفیسر کی یہ بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی کیونکہ امریکہ کی سب سے بڑی خوبی ان کی تعلیمی ترقی ہے، انہوں نے ہر چیز کو ایک موضوع، ایک مضمون کا درجہ دے دیا ہے اور پھر اسے ذیلی علوم کی شکل میں تقسیم کر دیا ہے۔ جتنی کتابیں امریکہ میں شائع ہوتی ہیں، اتنی کتابیں شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک میں شائع ہوتی ہوں، جتنے تعلیمی ادارے امریکہ میں ہیں، اتنے شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک میں ہوں، تو پھر امریکہ کم بخت ترقی کیوں نہ کرے، اور دنیا پر انہیں بالادستی کیوں حاصل نہ ہو۔ میں نے یہ سب کچھ لمحوں میں سوچا اور پروفیسر سے دوبارہ

اپنا سوال دُہرایا: ''میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ مغرب اور اسلام کی جنگ میں دوسرے فریق یعنی مسلمانوں میں کیا خامیاں پائی جاتی ہیں؟ آپ کا یہ کہنا ہے کہ صرف ایک یا دو فیصد مسلمان امریکہ مخالف ہیں تو کیا میں آپ کی اس بات کا یہ مطلب سمجھوں کہ دنیا کے اٹھانوے فیصد مسلمان یعنی مسلمانوں کی بھاری اکثریت عالمی امن کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اہل مغرب' مسلمانوں سے خوفزدہ کیوں ہیں؟'' پروفیسر نے تحسین آمیز انداز میں میری طرف دیکھا' ایک گہری سانس لی اور بولا: ''تم ایک ذہین لڑکے ہو' یہ بات تمہیں ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ موجودہ ترقی میں جن لوگوں نے بنیادی کردار ادا کیا' وہ دراصل مذہب کے حریف تھے' انہوں نے کلیسا کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی اور آخر کار اپنے علاقائی مذہب یعنی عیسائیت کو چرچ میں محصور کر دیا اور انسانی معاشرے میں مذہب کا عمل دخل صرف پیدائش اور وفات کی رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا۔'' میں نے دل ہی دل میں ایک مرتبہ پھر پروفیسر کو داد دی' وہ واقعی ایک دانشور تھا' اس کی یہ بات بالکل درست تھی کہ اگر آپ مغربی معاشرے کا بالعموم اور امریکہ کا بالخصوص گہری نظر سے جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ امریکی عمومی طور پر مذہب کے حریف ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امریکہ میں اخلاقی اعتبار سے جو بے راہ روی پائی جاتی ہے' عیسائیت سمیت دنیا کا کوئی بھی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا اور یہی وجہ ہے کہ امریکیوں نے اپنی معاشرتی زندگی سے عیسائیت کو نکال باہر کیا ہے۔ ''جب ان لوگوں نے نئے نظریات نئی سوچ پر کام کرنا شروع کیا تو کلیسا نے ان کی بھرپور مخالفت کی' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تصور پختہ ہوتا چلا گیا کہ مذہب اپنی بنیادی حقیقت کے اعتبار سے جمود پسند اور روایت پسند ہوتا ہے اور یہی جمود ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔'' میں نے پروفیسر کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا: ''لیکن اسلام ایسا مذہب نہیں ہے جو ترقی کا مخالف ہو۔'' پروفیسر میری بات سن کر دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہاری یہ رائے درست نہیں ہے۔'' میں نے پروفیسر سے پوچھا: ''آپ کس حوالے سے اسے غلط سمجھتے ہیں؟'' پروفیسر بولا: ''موجودہ دور کی تمام تر صنعتی و تعلیمی ترقی کس چیز کی مرہون منت ہے؟'' میں نے لمحے بھر کے لیے اس سوال پر غور کیا اور جواب دیا: ''میں اس بارے میں آپ سے جواب چاہتا ہوں۔'' میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس اہم سوال کے بارے میں اس جہاندیدہ کی سوچ کیا ہے۔ ''میرے بچے! موجودہ دور کی تمام تر ترقی' عالمی' معاشی نظام کی مرہون منت ہے۔'' پروفیسر نے ایک جملہ میں حقیقت بیان کر دی تھی حالانکہ میں یہ سوال سن کر دوسرے مختلف امکانات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ''اس موجودہ عالمی نظام میں بینکنگ سسٹم اور اسٹاک ایکسچینج کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔'' اس کی یہ بات بالکل درست تھی کیونکہ امریکہ سمیت تمام مغربی ممالک کے اکثر تعلیمی ادارے مختلف تجارتی اداروں کی طرف سے ملنے والی بھاری امدادی رقوم کی بنیاد پر چلتے ہیں اور اسی مالی امداد کی وجہ سے تلاش و تحقیق کا سلسلہ جاری رہتا ہے' ان تجارتی اداروں کا تمام تر کاروبار بینکنگ سسٹم کے ذریعے ہوتا ہے یا پھر کچھ بڑے عالمی ادارے اسٹاک ایکسچینج کی مدد سے اپنے کام کو وسعت دیتے ہیں۔ پروفیسر اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا: ''اور

اسلام ان دونوں کا مخالف ہے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے لاجواب کر دیا۔ میرے ذہن میں آئی کہ میں اس سے کہوں کہ اس موجودہ عالمی معاشی نظام نے انسانوں کے درمیان بہت تفاوت پیدا کر دیا ہے' غریب شخص غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا ہے اور امیر آدمی امیر سے امیر تر ہوتا چلا گیا ہے' میں نے اپنی بات پروفیسر سے کہی تو وہ بولا: ''کیا پھر ہمیں کمیونزم کا راستہ اختیار کرنا ہوگا؟'' میں کمیونزم کی تائید کیسے کر سکتا تھا تو میں نے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا۔ پروفیسر بولا: ''یہ ایک لمبی بحث ہے میں نے تمہارے ساتھ کوئی مذہبی بحث نہیں چھیڑی بلکہ میں تمہاری توجہ اس بات کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ اگر تم دنیا کے سامنے ایک سچے مسلمان کے طور پر خود کو پیش کرتے ہو تو پھر تم پر بہت سے اعتراضات کیے جائیں گے' تمہارے مذہب کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اُٹھائے جائیں گے اور یہ سب کام وہ لوگ کریں گے جو اپنے مذہب سے بیزار ہیں تو پھر بھلا انہیں تمہارے مذہب کے ساتھ کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔'' اس کے بعد پروفیسر مجھے امریکیوں کی اجتماعی نفسیات کے بارے میں بتانے لگا' ان میں سے بعض باتوں کا میں نے خود بھی مشاہدہ کیا تھا۔ تھوڑی دیر اسی طرح کی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ اس بات کا خواہش مند ہے کہ میں اس سے رخصت ہونے کی اجازت لے لوں۔ شاید اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا مقابل ایک جذباتی مسلمان ہے۔ جس کے سامنے اس کے مذہب کے بارے میں کوئی بھی غیر محتاط لفظ استعمال کیا گیا تو وہ مشتعل ہو سکتا ہے' آخر میں نے پروفیسر کی خواہش کے عین مطابق اس سے اجازت لی اور رخصت ہو کر اس کے گھر سے باہر آ گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے میں ان باتوں کے بارے میں سوچتا رہا جو پروفیسر نے بیان کی تھیں' ان میں سے بہت سی باتیں میرے لیے نئی تھیں۔ مجھے اس وقت کسی دانشور کا قول یاد آیا کہ عالم سے ایک گھنٹے کی گفتگو ایک برس کے مطالعے سے بہتر ہوتی ہے' انہیں خیالوں میں گم رہتے ہوئے مجھے راستہ طے ہو جانے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ ڈرائیور کے بریک لگانے پر جھٹکے کی وجہ سے میں چونکا تو خود کو ہاسٹل کی عمارت کے سامنے پایا' اپنے کمرے میں آ کر میں نے سب سے پہلے اپنی ڈائری کھولی اور پروفیسر رابن کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کے اہم نکات یاد کر کے انہیں نوٹ کرنے لگا۔ مجھے اس کی ایک بات بہت اچھی لگی جو اس نے یہ کہا تھا کہ تمہارا واسطہ جن لوگوں سے پڑے گا انہیں خود اپنے مذہب کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تو پھر بھلا انہیں تمہارے مذہب کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

پروفیسر رابن کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کے اہم نکات نوٹ کرنے کے بعد میں نے ویسے ہی اپنی ڈائری کے پچھلے صفحات اُلٹنے تاکہ پہلے کی نوٹ کی ہوئی باتوں میں سے کچھ کو دہرا لیا جائے' کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ بہت سی باتیں انسان بھول جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ تکرار کے نتیجے میں علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک صفحہ اُلٹا تو میرے سامنے امام زین العابدینؒ کا قول آیا' ہندوستان کے مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی مشہور کتاب ''کشف المحجوب'' میں یہ بات نقل کی ہے: ایک مرتبہ امام زین العابدینؒ سے

کسی نے دریافت کیا: اخلاق کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ''اخلاق یہ ہے کہ جب تم کسی سے راضی ہو تو باطل کی طرف جھکو نہیں اور جب کسی سے ناراض ہو تو حق کو چھوڑو نہیں۔'' میں کافی دیر اس عظیم قول کے معانی و مفاہیم پر غور کرتا رہا کہ اس جلیل القدر امامؒ نے کس طرح دو جملوں میں تمام انسانی نفسیات کا نچوڑ سمو دیا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ انسان کسی کی محبت میں باطل کی طرف جھک جاتا ہے' لوگ بیوی بچوں کو خوشیاں فراہم کرنے کے لیے حلال اور حرام میں تمیز نہیں کرتے ہیں' جبکہ دوسری طرف یہ بات بھی انسانوں کی عمومی نفسیات کا حصہ ہے کہ انسان جب کسی سے ناراض ہو تو اس کی مخالفت کرتے ہوئے عام طور پر حق کو چھوڑ دیتا ہے' اس بات کا عملی تجربہ مجھے آج پروفیسر رابن پیریز کے ساتھ گفتگو کے دوران ہوا۔ وہ ایک پڑھا لکھا' جہاندیدہ' سمجھدار شخص تھا لیکن اپنے آبائی مذہب کے ساتھ اپنی وابستگی کی وجہ سے وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں منفی جذبات رکھتا تھا اور اپنے انہی منفی جذبات کی وجہ سے اس نے کبھی حق کو قبول کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ جانتے بوجھتے ہوئے حق قبول کرنے سے پہلوتہی کی ہے۔ امام زین العابدینؒ بلاشبہ عظیم ترین شخصیت کے مالک تھے' وہ امام حسینؓ کے صاحبزادے تھے اور امام باقرؒ کے والد تھے۔ چند اور صفحات اُلٹنے کے بعد میرے سامنے قرآن کی یہ آیت آئی: ''اے ایمان والو! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ' وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔'' اس کو پڑھتے ہوئے بھی میرا ذہن پروفیسر رابن کے ساتھ ہونے والی آج کی گفتگو کی طرف چلا گیا' اس کا خلاصہ یہی تھا کہ آج کی دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک امریکیوں کے وظیفہ خوار ہیں۔ کیسی زیادتی کی بات ہے کہ آج مسلمان اپنے دفاع کے لیے بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے دست نگر ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اس حوالے سے اپنی ڈائری میں کسی جگہ ایک تقریر نوٹ کی تھی جو کسی تقریری مقابلے میں سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ تقریر شاید کسی دوسری ڈائری میں تھی' میں نے اپنی پرانی ڈائریاں نکالیں اور وہ تقریر تلاش کرنے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ایف سی کالج میں ہونے والے اس تقریری مقابلے میں اپنے کالج کے چند دوستوں کے ساتھ میں بھی شریک ہوا تھا۔ وہاں مختلف کالجز سے آئے ہوئے طلباء نے تقریریں کی تھیں۔ لیکن گورنمنٹ دیال سنگھ کالج سے تعلق رکھنے والا مقرر پہلے انعام کا مستحق قرار پایا تھا۔

میری طرح بہت سے افراد نے تقریب کے اختتام پر اسے مبارکباد دی تھی' میں اس سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ بعد میں اس سے ملنے کے لیے اس کے کالج گیا اور اس سے فرمائش کی کہ وہ اپنی تقریر مجھے املاء کروا دے۔ اس کی تقریر کو لفظ بہ لفظ تحریر کر کے واپس آ کر میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اگلے دن کے لئے اپنے کپڑے استری کیے اس کے بعد اسائنمنٹ تیار کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسائنمنٹ تیار کرتے ہوئے کس وقت میں نیند کی آغوش میں چلا گیا' خواب میں میں نے دیکھا کہ میں دریا کے ایک پل پر موجود ہوں اور مخالف سمت سے آنے والا ایک ٹرک تیز رفتاری سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میرے قریب پہنچ کر ٹرک کا

ڈرائیور مجھے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔اور اسی کوشش کے دوران پل کا جنگلا توڑ کر نیچے دریا میں گر جاتا ہے۔میں جنگلے سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو دریا میں پانی نہیں ہوتا اور ٹرک ڈرائیور دریا کی خشک مٹی پر تیزی سے ٹرک دوڑاتے ہوئے کنارے کی طرف چلا جاتا ہے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔میں چلتا ہوا پل کے دوسرے کنارے تک پہنچتا ہوں تو وہاں ایک شخص گن ہاتھ میں پکڑ کر کھڑا ہوتا ہے۔مجھے دیکھنے کے ساتھ ہی وہ گن کا رُخ میری طرف کرتا ہے اور میرے پاؤں کے قریب زمین پر چند گولیاں مارتا ہے۔میں اچھل کر پیچھے ہٹتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔مجھے ہلکا سا پسینہ آیا ہوا تھا۔دو مرتبہ موت کے قریب پہنچ کر بچ نکلنے کے باوجود میں کچھ خوفزدہ تھا۔اچانک مجھے دروازے پر دستک کی آواز آئی۔میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو ابھی رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔پہلے میں دستک کی آواز کو اپنا واہمہ سمجھا لیکن پھر دوبارہ دستک ہوئی تو میں غنودگی کے عالم میں تھا۔چلتا ہوا دروازے تک گیا اور کنڈی کھولی۔میرے دروازے کے سامنے لمبوترے چہرے کا مالک ایک درمیانی عمر کا شخص کھڑا ہوا تھا۔اس نے اپنا سروس کارڈ مجھے دکھاتے ہوئے کہا:"میں انتھونی زینگر ہوں فرام ایف-بی-آئی"۔

میری یہ عادت ہے کہ جب میں سوتا ہوں تو گدھے گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں' اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خواب میں کوئی شخص مجھے قتل کرنے کے درپے ہوتا ہے' کبھی کسی کے ساتھ مارشل آرٹس کے داؤ پیچ چل رہے ہوتے ہیں' بعض اوقات تو براہِ راست مجھ پر فائرنگ بھی شروع ہو جاتی ہے' کبھی کوئی ہولناک ایکسیڈنٹ ہونے لگتا ہے تو آخر کار گھبرا کے آنکھ کھل جاتی ہے' چند لمحوں کے لیے تو کچھ بھی سمجھ ہی نہیں آتا کہ کیا ہو رہا تھا؟ اور اب میں کہاں ہوں' چند لمحوں بعد شعور توجہ دلاتا ہے کہ بھائی تمہاری طبیعت بوجھل ہے' تم باتھ روم جا کے اس کو ہلکا کرو۔ پھر سمجھ آتی ہے کہ لاشعور مجھے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے مجبوراً خوفزدہ کر کے بیدار کرتا ہے' اپنی اس عام عادت کے تحت مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں' شاید مجھے باتھ روم جانے کی ضرورت ہے۔ انتھونی اس دوران میرے چہرے کے تاثرات سے شاید یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میں نیند کے زیر اثر ہوں۔ ''کیا مجھے اپنا تعارف دوبارہ کروانا ہوگا؟'' اس نے مہذب لہجے میں دریافت کیا' تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے' لیکن خواب میں بھی ایف بی آئی کا کوئی افسر آپ سے دوبارہ تعارف کروانے کے بارے میں دریافت کر سکتا ہے' میں نے ہاتھ کے ذریعے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ''تم مجھے دو منٹ دو۔'' میں نے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ذریعے اسے اشارے سے بتایا کہ میں باتھ روم سے ہو کر آتا ہوں۔ اپنی ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد میں نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور تولیے سے منہ پونچھ کر باہر آ گیا' انتھونی میری کتابوں کے ریک کے پاس کھڑا ہوا کتابوں کے نام پڑھ رہا تھا۔ اس کا ماتحت دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے جانے سے پہلے انہیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا' میری آہٹ سن لینے کے باوجود انتھونی نے مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ ''تم کیا پسند کرو گے؟ کافی یا کولڈ ڈرنک۔'' میری آواز پر وہ تیزی سے مڑا' اس کا مطلب تھا اس کی تمام تر حسیات میری طرف ہی متوجہ تھیں'' بہت شکریہ' میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔'' اس نے امریکیوں کے روایتی انداز میں شانے اُچکا کر ماتھے پر ہلکے سے بل ڈال کر' ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر جواب دیا تو میں نے فوراً کہا: ''ظاہر ہے تم اس وقت یہاں مجھے اپنی شادی کا دعوت نامہ دینے تو نہیں آئے ہو گے۔'' میری بات پر وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا اور پھر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ نہ جانے کیا سوچ کر رہ گیا۔ ''تمہاری حسِ مزاح اچھی ہے۔'' اس نے اپنے لہجے میں بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا' حالانکہ دروازے پر اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس کا لہجہ اچھا خاص تیکھا اور روکھا تھا۔ ''شکریہ! کیا مجھے دوبارہ پوچھنا ہوگا' کیا لو گے؟ کافی یا کولڈ ڈرنک۔'' میں نے اسی کے انداز میں اس سے دوبارہ دریافت کیا اور وضاحت کی: ''معاف کرنا شراب میں پیتا نہیں ہوں' اس لیے وہ میرے پاس ہے بھی نہیں۔'' میرے لہجے اور انداز پر وہ مسکرایا۔ ''شکریہ! میں نے بتایا ہے نا کہ میں ڈیوٹی پر ہوں۔'' اس کا لہجہ مزید نرم اور خوشگوار ہو چکا تھا۔ ''میرا اس بات کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے کہ کام کے دوران تمہاری پیشہ وارانہ اخلاقیات کیا ہیں؟ مجھے صرف یہ پتا ہے

کہ میرے گھر میں آیا ہوا کوئی شخص کھائے پئے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا خواہ وہ مدعو مہمان ہو یا پھر تمہاری طرح بن بلایا۔'' میری اس بات پر اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی' اس نے لمحے بھر کے لیے نظر اُٹھا کر اپنے ماتحت کی طرف دیکھا اور پھر پیپر ویٹ ہوا میں اچھال کر کیچ کرتے ہوئے بولا: ''پہلی بات یہ ہے کہ میں تمہارا مہمان نہیں ہوں' دوسرا یہ کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے اور تیسرا یہ کہ تمہیں کس بیوقوف نے یہ بتایا ہے کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔'' وہ اپنے جسم کو ڈھیلا کر کے اور ذرا سے پھیلا کر صوفے پر بیٹھے ہوئے بڑے آرام سے بولا' جیسے اب اسے کہیں نہیں جانا تھا۔ ''پہلی بات یہ ہے کہ یہ کمرہ جسے تم ہوسٹل کا ایک چھوٹا سا حصہ سمجھ رہے ہو یہ میرا گھر ہے' گھر کے لیے اپنی ملکیت ہونا یا مستقل قیام شرط نہیں ہوتا' ورنہ امریکی صدر بھی تو وائٹ ہاؤس میں عارضی طور پر ہی رہائش پذیر ہوتا ہے۔'' اس کے چہرے کے تاثرات سے محسوس ہوا کہ اس نے میری بات سے لطف لیا ہے۔ ''دوسری بات؟'' اس نے استفسار کیا۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ اس دروازے سے اندر پاؤں رکھ کر اس گھر کی حدود میں آنے والا ہر شخص میرا مہمان تصور ہوگا' خواہ وہ مدعو ہو یا نہ ہو' اور مہمان نوازی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ میزبان اپنی حیثیت کے مطابق مہمان کی خاطر داری کرے۔'' اس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔ ''تیسری بات؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ ''تیسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی صاحبِ اخلاق شخص مہمان کی جلد واپسی کا خواہاں نہیں ہوتا۔'' اس نے سر کو جھٹکا دیا تھوڑا سا اور پھیل کر بیٹھا اور بولا: ''کولڈ ڈرنک پلوا دو!'' میں نے فریج میں سے نکال کر کوکا کولا کا ایک ٹن پیک اسے دیا اور ایک اس کے ماتحت کو دے کر تیسرا خود کھول کر بیٹھ گیا' جب اس نے دو چار گھونٹ بھر لیے تو میں نے اس سے دریافت کیا: ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

میرے اس سوال کے جواب میں وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا' یوں جیسے کچھ سوچ رہا ہو' پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا اور فیصلہ کن حتمی لہجے میں بولا: ''تمہیں ہمارے ساتھ ہمارے تفتیشی مرکز چلنا ہوگا۔'' اس دوران اُس نے میرے چہرے کے تاثرات پر نظر رکھی' امریکہ میں مسلمانوں کے ساتھ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا جو رویہ تھا' اُس کے پیشِ نظر مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن کوئی سرکاری ایجنسی تفتیش کے بہانے مجھے بھی پکڑ کر لے جائے گی۔ اس لیے مجھے انتھونی کی بات سن کر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی' میں نے گھونٹ بھر کے اُس سے کہا: ''لگتا ہے کہ تم ادھار کے قائل نہیں ہو۔'' میرا ردِعمل شاید اُس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس لیے لمحے بھر کے لیے اُس کی آنکھوں میں حیرت ظاہر ہوئی اور اُس نے دریافت کیا: ''کیا مطلب؟'' میں نے جواب دیا: ''میرا مطلب یہ ہے کہ ابھی چند لمحے پہلے میں نے تمہیں اپنا مہمان قرار دیا تھا۔ اور اب تم مجھے اپنا مہمان بنانا چاہتے ہو۔'' میری بات سن کر وہ ہنس پڑا اور بولا: ''میں تمہیں اپنا مہمان اس لیے بنانا چاہتا ہوں تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ تم ذہین ہو یا چالاک؟'' میں نے تیزی سے بوتل کے باقی گھونٹ بھرے اور اُٹھ کر جوگر پہننے لگا۔ وہ دونوں مجھے اپنی تحویل میں لیے باہر آئے تو نیچے لان میں وارڈن کھڑا ہوا تھا' اُس کے ساتھ بھی ایک شخص موجود تھا جو اپنے حلیے سے ایجنسی کا آدمی لگ رہا تھا۔ ہمیں آتا ہوا دیکھ کر اُس نے الوداعی انداز میں وارڈن سے ہاتھ ملایا۔ وارڈن کے پاس سے گزرتے

ہوئے میں نے سر کی جنبش کے ساتھ اُسے سلام کیا تو اُس نے جواب میں مجھے شب بخیر کہا' اُس کی یہ بات سن کر میں رُک گیا۔ اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''مجھے FBI والے اُٹھا کر لے جا رہے ہیں' یہ ساری رات مجھے جگا کر تفتیش کریں گے۔ حوالات میں بند رکھیں گے اور تم مجھے رات خیریت سے گزارنے کی دعا دے رہے ہو۔'' میری اس بات پر وارڈن کے ہونٹوں پر مجوب سی مسکراہٹ رینگ گئی' ہوسٹل کی عمارت کے باہر سیاہ شیشوں والی دو کاریں کھڑی تھیں۔ انتھونی نے مجھے آگے والی کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس کا ماتحت پیچھے سے گھوم کے آ کر میری دوسری طرف بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ پر سپاٹ اور لمبے چہرے کا مالک ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی گاڑی ایک نواحی آبادی تک پہنچ گئی اور ایک گھر کے سامنے رک گئی میں نے وہ علاقہ پہلے نہیں دیکھا ہوا تھا' لیکن وہاں آس پاس تمام گھر بڑے اور خوشنما بنے ہوئے تھے۔ ہر گھر کے سامنے اور دائیں بائیں کچھ حصہ کھلا تھا۔ وہ لوگ مجھے لے کر گھر کے اندر داخل ہوئے۔ اندر ایک جگہ سیڑھیاں نیچے اُتر رہی تھیں۔ انتھونی مجھے ساتھ لے کر تہہ خانے میں اُتر گیا۔ وہ ایک عام سا تہہ خانہ تھا۔ جس کے ایک کونے میں ایک بڑا سا گدا رکھا ہوا تھا' اُس کے ساتھ بڑے حجم کے دو صوفے پڑے ہوئے تھے' سامنے کی دیوار پر شاید پچاس انچ کی بڑی سی LCD لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف الماری میں اوپر کے خانوں میں ناول کی طرز کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور نیچے کا خانہ میگزین سے بھرا ہوا تھا' بظاہر دیکھنے میں وہ کسی تحقیقاتی ایجنسی کا تفتیشی مرکز محسوس نہیں ہوتا تھا' کمرے میں روشنی بڑی مناسب سی تھی' نہ بہت تیز نہ بالکل ہلکی۔ انتھونی نے مجھے اشارے کے ذریعے صوفے پر بیٹھنے کو کہا پھر وہ اور اُس کا ماتحت سیڑھیاں چڑھ کر تہہ خانے سے باہر نکل گئے۔ میں اب تہہ خانے میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ یہ خوف نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے مار دیں گے یا جسمانی اذیت پہنچائیں گے' انہوں نے مجھے نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کی بہترین اور کامیاب کوشش کی تھی۔ یہ بہت اچھا اور نفسیاتی حربہ تھا کہ آپ اپنے مدِ مقابل کو ایسی صورتِ حال سے دوچار کر دیں جو اُس کی توقع کے خلاف ہو۔ تو مقابل یقیناً کنفیوژ ہو جائے گا' میرا یہ خیال تھا کہ جس طرح میں نے انگریزی فلموں میں دیکھا ہوا ہے' وہ مجھے کسی اونچی بلڈنگ کی اٹھارویں یا انیسویں منزل پر موجود تفتیشی مرکز میں لے کر جائیں گے۔ جہاں مجھے ایک کمرے میں لے جایا جائے گا جس کے تین اطراف میں سپاٹ دیوار ہوگی اور چوتھی طرف فرش سے لے کر چھت تک شیشہ لگا ہوا ہوگا' جس میں مجھے اپنی شکل نظر آ رہی ہوگی' اُس شیشے کے ساتھ آنکھیں لگانے کے باوجود مجھے کچھ دکھائی نہیں دے سکے گا۔ لیکن شیشے کے دوسری جانب موجود تفتیشی افسران میری تمام ترحرکات وسکنات دیکھ رہے ہوں گے۔ کمرے کے درمیان میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہوگی' جس کے دونوں طرف ایک ایک کرسی رکھی ہوگی' ایک پر میں بیٹھ جاؤں گا اور دوسری کرسی پر میرے سامنے آ کر تفتیشی افسر بیٹھ جائے گا' لیکن یہاں تو صورتِ حال میری توقع سے بالکل مختلف تھی' وہ تو مجھے یوں چھوڑ کر چلے گئے تھے جیسے میں اُن کا کوئی مہمان تھا۔ پانچ دس منٹ گزرنے کے بعد یہ رات' تنہائی اور اجنبیت میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی۔

میں نے چند مرتبہ بے چینی سے پہلو بدلا' پھر ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو میری نظر سائڈ کی میز پر پڑے ہوئے ریموٹ کنٹرول پر پڑی جو شاید اُس بڑی LCD کا تھا جو دیوار پر لگی ہوئی تھی' میں نے ریموٹ اُٹھا کر T.V آن کیا تو سکرین پر ایک بار فلم چل رہی تھی' جس میں چہرے پر ماسک لیے ہوئے اور سیاہ لبادہ پہنے ہوئے خنجر بدست ایک شخص موجود تھا۔ منظر تبدیل ہوا تو اُس کے سامنے ایک خوبرو جوان لڑکی بندھی ہوئی پڑی تھی۔ اُس شخص نے خنجر اُس لڑکی کی شہ رگ پر رکھا اور اُسے ذبح کر دیا۔ میں اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا' مجھ سے اتنا بھی نہ ہوا کہ میں ریموٹ کے ذریعے چینل ہی تبدیل کراوں' میں نے آنکھیں بند کیں اور جلدی جلدی زیر لب آیۃ الکرسی پڑھنا شروع کی' اُس سے مجھے کچھ حوصلہ اور سکون محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور ریموٹ کا بٹن دبا کر T.V کو بند کر دیا' پھر مجھے جتنی بھی دعائیں اور آیات یاد تھیں' ایک کے بعد ایک وہ ساری پڑھ لیں۔ میرے پاس دعاؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اب مجھے یہ سمجھ نہ آئے کہ میں کیا کروں' چشمِ تصور سے میں نے دیکھا کہ مجھے امریکہ سے ڈی پورٹ کر دیا گیا ہے۔ اور میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے گھر واپس جا رہا ہوں' میرا تمام کیرئیر ختم ہو گیا ہے۔ ابا جان نے مجھے امریکہ بھجوانے کے لیے اپنی آبائی زمین اور امی کے سونے کے زیورات فروخت کر کے روپوں کا انتظام کیا تھا۔ وہ ساری رقم ڈوب گئی ہے۔ یہ سب سوچ کر مجھے اپنا دورانِ خون تیز ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ شاندار مستقبل' کسی بین الاقوامی ادارے میں اعلیٰ ملازمت' بڑا سا گھر' بہترین گاڑی' میرے سب خواب عنقریب چکنا چور ہونے والے تھے۔ اس وقت میرے ذہن سے اسلام اور مغرب کی باہمی کشمکش' اہل مغرب کی مسلمان ممالک کے خلاف سازشیں' زیادتیاں' سب کچھ فراموش ہو چکا تھا۔ مجھے صرف اپنی فکر تھی' اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ مجھے یاد آیا کہ پروفیسر نکلسن نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں اپنے آپ کو صرف نصابی سرگرمیوں تک محدود رکھوں۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اُس تہہ خانے میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی' ہو بھی نہیں سکتی تھی' ورنہ میں اُس سے باہر جھانک کر دل کو بہلانے کی کوئی ترکیب کرتا' تنگ آ کر میں نے ریموٹ اٹھایا اور T.V آن کر لیا۔

سکرین پر وہی ہارر فلم چل رہی تھی' میں نے چینل تبدیل کر دیا۔ اگلے چینل پر رسل کرو کی مشہور فلم ''گلیڈ یئٹر'' لگی ہوئی تھی۔ میں یہ فلم پہلے بھی دیکھ چکا تھا' اُسے دیکھ کر ایک مرتبہ مجھے پھر حوصلہ ہوا میں نے سوچا انسان کو کسی بھی قسم کی صورتِ حال میں گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ اپنے ہوش وحواس کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں پوری توجہ سے فلم دیکھنے لگا۔ شاید دس یا پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے تہہ خانے کا دروازہ کھلنے کی آہٹ محسوس ہوئی' میں نے مڑ کر دیکھا کوئی سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ میری نظر کے سامنے سب سے پہلے اُترنے والے کا پاؤں آیا جس نے ایک ہیل والی جوتی پہنی ہوئی تھی' وہ شاید کوئی عورت تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ میرے سامنے آ گئی' کمرے میں روشنی اتنی تھی کہ مجھے اُس کے خدوخال نمایاں طور پر نظر آ جاتے۔ بلاشبہ وہ انتہائی حسین اور دیدہ زیب عورت تھی' اُس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ میرے پاس والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اور اُس نے مجھے مخاطب کیا: ''تم خود کو خوف زدہ تو محسوس نہیں کر رہے ہو؟'' میں نے

اثبات میں سرہلایا اُس نے پوچھا: ''میں تمہارے لیے وہسکی منگواؤں؟'' میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا: ''میں شراب نہیں پیتا۔'' شاید یہ بات اُسے پہلے سے معلوم تھی۔ ''پھر تم کیا لینا پسند کرو گے؟'' اُس نے نرم لہجے میں دریافت کیا تو میں نے اپنی خواہش بیان کر دی: ''ٹھنڈے دودھ کا گلاس۔'' میری بات پر وہ مسکرا دی اور بولی: ''اب تمہاری دودھ پینے کی عمر نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا: ''لیکن اس وقت مجھے ٹھنڈے دودھ کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔'' ہمارے خاندان میں کیونکہ اکثر افراد ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں اُس لیے مجھے بعض اوقات اس کی شکایت ہو جاتی ہے اور اس صورت میں ٹھنڈا دودھ پینے سے طبیعت میں افاقہ محسوس ہوتا ہے' کیونکہ اُس وقت بھی مجھے اپنا دورانِ خون تیز محسوس ہو رہا تھا' اس لیے میں نے دودھ کی فرمائش کر دی تھی۔ ''تم شراب کیوں نہیں پیتے؟'' اُس کے سوال کا جواب تو یہی تھا کہ میرا مذہب مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سے پہلے چند مرتبہ میں نے اس سوال کا یہی جواب دیا تو مجھ سے اگلا سوال یہ کیا جاتا تھا کہ امریکہ سمیت دنیا بھر میں بہت سے مسلمان شراب پی لیتے ہیں تو تم کیا انتہاء پسند مسلمان ہو؟ اس لیے میں نے اگلے سوال سے بچنے کے لیے یہ جواب دیا: ''دراصل میرا ایک بھائی زہریلی شراب پینے کی وجہ سے فوت ہو گیا تھا' تو میری ماں نے مجھے یہ قسم دی تھی کہ میں زندگی میں کبھی بھی شراب نہیں پیوں گا۔'' میرے اس جواب پر وہ دھیمے سی مسکرائی۔ ''تم جھوٹ بہت روانی سے بول لیتے ہو۔'' میں اُس کی اس بات پر چونکا۔ ''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانگی سے دریافت کیا۔ ''ہماری معلومات کے مطابق پاکستان میں تمہارا صرف ایک بھائی ہے' جو ایک جنرل سٹور چلا رہا ہے۔'' مجھے اُس کی یہ بات سن کر ایک جھٹکا سا لگا۔ ''تمہاری معلومات قابلِ داد ہیں۔'' میں نے اُس کی تعریف کی' اُس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا: ''اب تمہارا کیا خیال ہے' تم میرے ساتھ سچ بولنا پسند کرو گے یا اب بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کرو گے؟'' میں اُس کے اس سوال کے جواب میں سوچ میں پڑ گیا۔

اُن لوگوں کے وسائل اور ذرائع میرے توقع سے زیادہ اور تیز تھے۔ اُس نے تفتیش کے آغاز میں ہی میرا جھوٹ پکڑ کر مجھے زیرِ اثر لانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اب میں نے کوئی بات غلط بیان کی اور میری غلط بیانی پکڑی گئی تو یہ بات میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ''میں تمہاری ہر بات کا درست جواب دوں گا۔'' میں نے یقینی لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں امریکہ کو کوئی نقصان پہنچانے کا اختیار دیا جائے تو تم کیا کرو گے؟'' اُس کا سوال بہت ہی عجیب و غریب تھا' اگر میں اُسے یہ جواب دیتا کہ میں امریکہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تو وہ اسے جھوٹ سمجھتی کیونکہ امریکی معاشرے میں بطورِ خاص امریکی ریاستی اداروں میں یہ تصور پختہ ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک دنیا کا سب سے اہم فرض امریکہ کو نقصان پہنچانا ہے اور اگر میں اُسے یہ جواب دیتا کہ میں امریکہ کو کون سا نقصان پہنچانا پسند کروں گا' تو وہ مجھ سے اس کی وجہ دریافت کر سکتی تھی' میں نے دل کڑا کر کے اُسے جواب دیا: ''مجھے اگر موقع دیا جائے تو میں CIA کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا' تمہارے نزدیک یہ امریکہ کا نقصان ہو گا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ درحقیقت یہ امریکہ کا فائدہ ہو گا۔''

میرا یہ جواب شاید اس کی توقع کے خلاف نہیں تھا۔ ''تم امریکہ کے اتنے خیر خواہ کیوں ہو؟'' اُس نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا' میں نے جواب دیا: ''یہ صرف امریکہ ہی نہیں باقی دنیا کے لیے بھی فائدہ مند ہوگا۔'' اُس نے میری اس بات پر سر ہلایا اور بولی: ''اوہ! تو تم ساری دنیا کے خیر خواہ ہو۔'' اُس کے لہجے میں طنز موجود تھا۔ ''میں یہاں تمہارے ساتھ صحیح یا غلط کے بارے میں بحث کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ کسی بھی مسئلے میں میری کوئی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے اپنی طرف سے بات ختم کرنے کی کوشش کی' اُس کے بعد اُس نے مجھ سے میری سابقہ زندگی کے بارے میں سوالات کیے' جن کے میں جواب دیتا رہا۔ اُس نے CIA کے بارے میں میرے منفی احساسات کا سبب دریافت کیا تو میں نے اُسے بتایا کہ کن عوامل کی بنیاد پر مجھے CIA کی کارروائیاں پسند نہیں ہیں' مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اُس کے ساتھ ہونے والی میری تمام گفتگو کو ریکارڈ کیا جا رہا ہوگا' بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ خفیہ کیمرے ویڈیو بھی بنا رہے ہوں گے تاکہ ان باتوں کو آئندہ کسی وقت میں میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے' میں لاشعوری طور پر اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ اب میرا مقدر امریکہ سے ڈی پورٹ ہونا ہے۔ کم وبیش ڈیڑھ گھنٹے تک مختلف نوعیت کے سوالات کرنے کے بعد وہ عورت بولی: ''تمہیں شاید محسوس نہیں ہوا ہوگا کہ میں نے تم سے ایسے سوالات بھی کیے ہیں کہ اگر تم نے کسی سوال کا جواب غلط دیا ہوگا تو بعد کے کسی سوال کے جواب میں تمہارا بیان اُس جھوٹ اور غلط بیانی کو واضح کر دے گا۔'' میرے لیے اُس کی بات ناقابلِ فہم تھی کیونکہ اُس کے سوالات کے دوران مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

لیکن میں نے یہ بات کہیں سن رکھی تھی یا شاید کسی ناول میں پڑھ رکھی تھی کہ ماہرین نفسیات نے کچھ ایسے سوالات تیار کر رکھے ہیں' جن کا جواب دیتے ہوئے انسان جھوٹ بولے تو اگلے کسی سوال کے جواب میں اُس کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے۔ میرے ساتھ تفتیش کا تفصیلی سیشن مکمل کرنے کے بعد وہ عورت اُٹھنے لگی تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ''اگر تم بُرا نہ مناؤ تو میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' اُس نے میرے سوال پر بھنویں اُچکائیں اور بولی: ''شیکسپیئر نے کہا ہے: گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو وہ گلاب ہی رہتا ہے۔'' بلاشبہ وہ سراپا گلاب تھی' لیکن میں نے اس کا نام کسی اور خیال کے تحت دریافت کیا تھا۔ ''میں اصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا FBI میں تفتیش کے لیے کوئی مرد باقی نہیں رہا جو انہوں نے تمہیں بھیج دیا ہے۔'' اُس نے میری بات کو غور سے سنا اور بولی: ''تمہارا ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ تم لڑکیوں کے ساتھ دوستی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ عورتوں کے سامنے جلد کنفیوژ ہو جاتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ میرے بارے میں پوری طرح چھان بین کر چکے تھے۔ میں نے اپنی ذہنی خلش ختم کرنے کے لیے اُس سے اگلا سوال بھی کر ہی لیا: ''تم لوگ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے اس غیر روایتی جگہ پر کیوں لائے ہو؟'' گو کہ مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ اس میں بھی ملزم کی نفسیات اور تفتیش کے طریقہ کار سے متعلق کوئی اصول کارفرما ہوگا لیکن میں اُس کی زبانی بھی کچھ سننا چاہتا تھا۔ ''ہماری تحقیقات کے مطابق تم کسی گروہ یا تنظیم کے آلہ کار نہیں

ہو۔'' مجھے اس جواب پر حیرت ہوئی اور میں نے دریافت کیا: ''پھر تم لوگ مجھے یہاں لے کر کیوں آئے ہو؟'' میری بات پر وہ مسکرائی۔ ''تم سرِ عام امریکہ اور CIA کے خلاف بولتے ہو تو کوئی بھی دہشت گرد تنظیم تمہارے جذبات کا فائدہ اُٹھا کر تمہیں اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ اس لیے ہم نے تمہارا سارا ریکارڈ محفوظ کر لیا ہے اور تمہیں یہ باور کروانے کے لیے یہاں بُلایا ہے کہ تمہاری کوئی بھی غلطی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہے گی۔'' اس نے اُٹھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مصافحہ کر کے وہ وہاں سے رخصت ہو گئی' اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اُس کے سوالوں' اپنے جوابات اور اس کے دیئے ہوئے مشورے کے بارے میں سوچتا رہا جو میرے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد کافی دیر گزر گئی' لیکن پھر کوئی شخص وہاں نہیں آیا' مجھے لاشعوری طور پر کچھ سکون محسوس ہوا۔ کیونکہ جب میں نے غور کیا تو اُس عورت کی باتوں سے مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ لوگ ابھی مجھے ڈی پورٹ نہیں کریں گے اور اُن کا رویہ میرے ساتھ معاندانہ نہیں تھا بلکہ صرف پیشگی احتیاط پر مبنی تھا۔

میں نے یہ ارادہ کیا کہ آئندہ میں اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز رکھوں گا اور لوگوں کے ساتھ ملنے میں احتیاط کروں گا کیونکہ آپ کسی بھی شخص کے بارے میں یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اُس کا تعلق کون سی تنظیم سے ہے۔ وہ تنظیم کوئی دہشت گرد تنظیم ہو یا کوئی ریاستی ایجنسی ہو' دونوں صورتوں میں نقصان آدمی کا اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے مزید وقت گزر گیا' کچھ دیر بعد تہہ خانے کی سیڑھیوں پر آہٹ محسوس ہوئی' آنے والا شخص انتھونی تھا' اس کے پیچھے اُس کا ماتحت بھی تھا۔ ''میرا خیال ہے تم یہاں آرام سے سو نہیں سکو گے۔ اس لیے ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔'' اُس نے آتے ہی یہ بات کہی تو میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا' وہی گاڑی جو ہمیں لے کر آئی تھی' اُسی میں بیٹھ کر ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے' راستے میں انتھونی نے مجھے مخاطب کیا: ''اچھے لڑکے اس وقت ہوسٹل جانا مناسب نہیں ہے۔ اور اگر میں نے تمہیں کسی ہوٹل کے آگے اُتارا تو تم یہ سمجھو گے کہ شاید وہ ہوٹل بھی ہمارا کوئی مرکز نہ ہو۔ یوں تم ساری رات بے آرام رہو گے۔ اس لیے میں تمہیں شبینہ کلبوں کے علاقے میں کسی جگہ اُتار دوں گا۔ ہوٹل کا انتخاب تم نے خود کرنا ہے۔'' اور ایسا ہی ہوا' اُس نے رات کے وقت آباد ہونے والے شہر کے بدنام علاقے میں ایک جگہ مجھے اُتار دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے کوئی تنبیہ یا نصیحت کرنے کی کوشش کریں گے' لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا' شاید انہوں نے اپنے ذرائع اور وسائل کا نفسیاتی خوف میرے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اُن کا یہ طریقہ کار پسند آیا' انہوں نے مجھے روایتی طریقے سے گرفتار کر کے حوالات میں رکھنے کی بجائے غیر روایتی طریقہ اختیار کیا تھا اور میں نے خود سے یہ اعتراف کیا کہ اُن کا طریقہ کار مجھ پر اثر انداز ہوا تھا اور میں کسی حد تک خوف زدہ ہو کر آئندہ محتاط رہنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ ایک دو ہوٹلوں میں جھانکنے کے بعد مجھے اپنے مطلب کا ہوٹل مل ہی گیا' یہاں میرے خیال کے مطابق رات بسر کی جا سکتی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں آ کر کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد آخر کار مجھے نیند آ ہی گئی' صبح جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دس بج چکے تھے' کمرے میں ناشتہ منگوا کر

میں نے ناشتہ کیا اور باہر آ کے کاؤنٹر پر چابی واپس کر کے میں ہوٹل سے باہر نکل آیا' آج میرا یونیورسٹی جانے کا موڈ نہیں تھا' کچھ دیر تو میں سڑک پر اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا' پھر میں نے پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور اُس میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے انگریزی کا ایک لفظ استعمال کیا: ''کہاں؟'' اُسے شاید انگریزی نہیں آتی تھی' شکل وصورت سے وہ ایشیائی باشندہ محسوس ہوا' میں نے اُسے کہا: ''چلتے رہو۔'' کچھ دیر بعد میں نے اُس سے دریافت کیا: ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' اُس نے مختصر جواب دیا: ''انڈیا۔'' میں نے اُس سے اُردو میں پوچھا: ''انڈیا میں کہاں کے؟'' میری اُردو پر اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور خوش ہو کر پوچھا: ''آپ بھی ہندوستانی ہیں؟'' میں نے اُسے ہدایت کہ وہ آگے کی طرف دیکھ کر گاڑی چلائے' پھر اُسے بتایا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ ''میں رام پور کا رہنے والا ہوں آپ؟'' اُسے اپنا ہم زبان ملنے کی بہت خوشی ہوئی تھی۔ اور شاید وہ اسی لیے میرے ساتھ گپ شپ کرنا چاہ رہا تھا' امریکہ میں تلاشِ روزگار میں آنے والوں کا یہ بڑا المیہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول سے اُٹھ کر آتے ہیں جہاں انہیں فراغت کے لمحات بہت زیادہ میسر ہوتے ہیں' لیکن امریکہ آنے کے ساتھ ہی وہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں کہ انہیں بارہ سے لے کر اٹھارہ گھنٹے تک مسلسل مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ اور دن ورات کے بقیہ اوقات کے چند گھنٹے وہ سونے میں گزار دیتے ہیں' تاکہ اگلے دن دوبارہ کام پر جانے کے قابل ہو سکیں۔ انہیں کسی کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے' خواہ مخواہ وقت گزارنے کی عیاشی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ بھی شاید ایسا ہی شخص تھا۔ ''میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔'' میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ تو وہ بولا: ''لاہور' داتا کی نگری۔'' میں نے اُس سے دریافت کیا: ''تمہاری قوم کیا ہے؟'' اُس نے بتایا: ''ہم بڑیچ افغان ہیں۔'' پھر وہ بتانے لگا کہ اُس کے آباء واجداد مغلوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور پھر یہی رہ گئے۔ اُس کے والد رام پور میں بس ڈرائیور تھے۔ لیکن وہ کسی طرح اِدھر اُدھر سے اُدھار پکڑ کے امریکہ آ گیا' یہ اُس زمانے کی بات ہے جب امریکہ کا ویزا آسانی سے مل جایا کرتا تھا۔ آدمی کو صرف جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست کرنا ہوتا تھا۔ یہاں آ کر اُس نے اتنی ترقی کی تھی کہ یہ ٹیکسی جسے وہ چلا رہا تھا اُس کی اپنی ملکیت تھی اور اس کے علاوہ وہ ایک اور ٹیکسی کا مالک تھا۔ اس کام میں اُسے جو آمدن ہوتی تھی اُس کے ذریعے اُس کے گھر والے ہندوستان میں متوسط طبقے کے خوشحال افراد کی مانند زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں' ایک بھائی تھا جس نے اپنی دوکان سیٹ کر لی تھی' لیکن وہ خود ایک مرتبہ بھی واپس نہیں جا سکا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اگر وہ ایک مرتبہ واپس چلا گیا تو اُس کے لیے دوبارہ امریکہ آنا ممکن نہیں ہوگا۔ اُس کے پوچھنے پر میں نے اُسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں یہاں تعلیم کے سلسلے میں مقیم ہوں' میں نے اُس کے سامنے یہ وضاحت نہیں کی کہ گزشتہ رات میں FBI کا مہمان تھا ورنہ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ وہ اسی وقت مجھے ٹیکسی سے اتار دیتا۔ میرے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ وہ روزانہ پچاس سے لے کر ستر ڈالر تک بچت کر لیتا ہے۔ میں نے اُسے کہا: ''آج میں تمہیں ستر ڈالر دوں گا اور تمہیں تیس ڈالر پٹرول کا خرچ دوں گا' تم نے اگلے پانچ چھ گھنٹے

میرے ساتھ گزارنے ہیں۔'' وہ بخوشی اس پر تیار ہوگیا۔ ہم شہر کے مختلف علاقے گھومتے پھرتے ہوئے شہر کے سب سے بڑے پارک کے پاس آ کر رُک گئے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ ہم آزادانہ طور پر کسی فکر اور پریشانی کے بغیر اگلا ایک گھنٹہ پارک میں گزاریں گے۔ پارک میں آ کر ہم تھوڑی دیر بے مقصد چلتے رہے اور پھر ایک بڑے درخت کے نیچے موجود بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک شخص دنیا و مافیہا سے بے خبر چت سویا ہوا تھا۔ میرا دوست گل خان بڑے اشتیاق سے اُس کی طرف دیکھنے لگا' میں نے اُس کی دلچسپی کی وجہ دریافت کی تو بولا:''ہمارا بابا جی بھی اسی طرح سر کے نیچے کچھ رکھے بغیر بالکل سیدھا لیٹ کر سو جاتا ہے اور مسلسل بارہ' چودہ گھنٹے تک سویا رہتا ہے۔'' میں یہ سمجھا کہ شاید وہ بابا جی اُس کے خاندان کا بڑا بزرگ ہوگا جو تلاشِ روزگار کے سلسلے میں اُسی کی طرح امریکہ آیا ہوگا' لیکن مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ بارہ یا چودہ گھنٹے تک مسلسل سونے والا شخص امریکہ میں گزارا کیسے کر سکتا ہے' کیونکہ یہاں تو بارہ چودہ گھنٹے مسلسل کام کرنے سے بھی تو اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے یہاں آ کر خوب محنت کی ہو اور اپنا کام اس طرح سیٹ کر دیا ہو کہ اُسے بیٹھے بٹھائے آمدن ہو جاتی ہو۔ اور پھر وہ شخص کوئی نشہ آور چیز استعمال کرنے کی عادت میں مبتلا ہو گیا ہو' کیونکہ نشہ کیے بغیر بارہ سے چودہ گھنٹے تک نہیں سویا جا سکتا۔ گل خان نے مجھ سے پوچھا:''آج ہم آپ کو اپنے بابا جی سے نہ ملوائیں۔''

میری استفسار پر اُس نے بتایا:''جس صاحب کو وہ بابا جی کے نام سے یاد کر رہا ہے' اُن کا نام حاجی نزاکت علی ہے اور وہ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ یہ تو پتہ نہیں ہے کہ وہ امریکہ کب آئے تھے۔ تاہم اتنا معلوم ہے کہ وہ پچھلے کئی برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں' پہلے یہاں انہوں نے شادی کی تھی لیکن پھر اُن کی اہلیہ نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اب وہ اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتے ہیں کوئی کام نہیں کرتے لیکن ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ فلیٹ کا کرایہ دیتے ہیں اور یوٹیلٹی بل ادا کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک سرکاری ایجنسیاں بھی اُن کے بارے میں تحقیقات کرتی رہی ہیں کہ آخر اُن کے پاس یہ رقم کہاں سے آتی ہے' ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اُن کے فلیٹ میں سے ہر ایک چیز نکال لی گئی' دیواروں اور چھت کے علاوہ اور کوئی چیز اندر موجود نہیں رہی۔ مسلسل ایک ہفتے تک اُن کے دروازے پر پہرے دار تعینات رہے تا کہ باہر سے کوئی شخص اندر نہ آئے اور اندر موجود شخص باہر نہ جا سکے۔ ایک ہفتے کے دوران کھانے پینے کی کوئی بھی چیز اندر نہیں گئی اور اندر بھی کچھ موجود نہیں تھا۔ ایک ہفتے کے بعد جب ایجنسی کا متعلقہ افسر فلیٹ کے اندر گیا تو حاجی صاحب کی شیو تازہ بنی ہوئی تھی' انہوں نے جو شرٹ پہن رکھی تھی وہ ایسی تھی جیسے کچھ دیر پہلے استری کر کے پیش کی گئی ہو' حالانکہ ان کے فلیٹ میں شیو' استری یا کپڑے دھونے کا کوئی سامان نہیں تھا اور اُن کے جسم پر وہی لباس تھا جو انہوں نے ایک ہفتہ پہلے پہنا تھا۔ سخت پہرے کی وجہ سے باہر سے کسی چیز کا اندر آنا ممکن نہیں تھا۔ حاجی صاحب سے اس بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تو اُن کا یہ کہنا تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ تفتیشی افسر اس بات سے مطمئن نہیں ہوا' انہوں نے فرمایا: تم اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بتاؤ کہ اس میں کیا ہے؟''

اُس تفتیشی افسر نے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا سروس کارڈ باہر نکالا اور بتایا کہ اُس کی جیب میں صرف یہی موجود ہے' حاجی صاحب نے اُسے اپنی جیب اچھی طرح کھنگالنے کی ہدایت کی لیکن اُس جیب میں مزید کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کے بعد انہوں نے تفتیشی افسر کو دوسری باتوں میں مشغول کر لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے تفتیشی افسر سے کہا کہ اب تم اپنی جیب میں ہاتھ ڈالو' اُس میں ایک سو ڈالر کا نوٹ ہوگا' افسر نے ہاتھ جیب میں ڈال کر باہر نکالا تو اُس کے ہاتھ میں ایک سو ڈالر کا نوٹ تھا۔ بعد میں ایجنسی نے اُس نوٹ کی پوری تحقیق کی کہ وہ اصلی ہے تو وہ واقعی اصلی تھا۔ لیکن وہ یہ پتا نہیں چلا سکے کہ وہ نوٹ آیا کہاں سے تھا؟ کچھ عرصہ وہ حاجی صاحب کو تفتیش کے نام پر تنگ کرتے رہے' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حاجی صاحب اپنے حال میں مگن رہنے والے بزرگ ہیں' تو انہوں نے اُن کا پیچھا ترک کر دیا۔ گل خان کی سنائی ہوئی یہ ساری کہانی مجھے خاصی بور محسوس ہوئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ گل خان ایک ضعیف الاعتقاد شخص ہے لیکن میں نے اُسے کچھ کہا نہیں' میری خاموشی کا اُس نے غلط مطلب کیا اور وہ یہ سمجھا کہ شاید میں بھی اُس کے باباجی سے ملنے کا خواہش مند ہوں' وہ بڑے پُرجوش انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ''ہم ابھی آپ کو باباجی کے پاس لے کر جاتا ہے۔'' میں نے پہلے تو معذرت کرنا چاہی لیکن پھر اُس کے جوش وخروش کو دیکھ کر اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک ایسی آبادی میں آیا جہاں پرانی عمارات موجود تھیں۔ ایک پرانی سی عمارت کے سامنے سڑک کے سامنے اُس نے گاڑی روکی اور مجھے ساتھ لے کر عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ عمارت کی لفٹ شاید خراب تھی کیونکہ ہم سے پہلے ایک عورت سیڑھیوں کے ذریعے ہی اوپر گئی تھی۔ چار منزلوں کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے اچھی خاصی تھکن محسوس ہونے لگی۔ آخر چھٹی منزل پر پہنچ کر گل خان سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے راہداری کی طرف گھوم گیا اور ایک دروازے کے سامنے رک کر اس نے آہستگی سے دستک دی' چند لمحے بعد دروازے کے دوسری طرف آہٹ محسوس ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ ہمارے سامنے جو شخص کھڑا تھا' اُس کی شرٹ نہایت صاف ستھری' استری شدہ اور قیمتی تھی۔ جب کہ اُس نے جو پینٹ پہن رکھی تھی وہ بوسیدہ' گندی اور شکن آلود تھی۔

حاجی نزاکت صاحب کا ظاہری حلیہ واقعی عجیب و غریب تھا۔ میں نے امریکہ میں اپنے قیام کے دوران یہ دیکھا تھا کہ نوجوان امریکی اپنی ظاہری حالت ایسی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ ان کے حلیے کی وجہ سے اُن کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس کے لیے وہ عجیب و غریب تراش خراش کا لباس پہنتے ہیں' بالوں کے نت نئے سٹائل بناتے ہیں' لیکن میں نے کبھی ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس نے نئی محسوس ہونے والی صاف شفاف استری شدہ شرٹ کے ساتھ میلی سی بوسیدہ شکن آلود پینٹ پہنی ہو۔ گل خان کے بیان کے مطابق حاجی صاحب اپنے فلیٹ میں ہی مقیم رہتے تھے۔ اس لیے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے یہ حلیہ اختیار کیا ہوگا۔ اُن کے چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی شیو بنا کر آئے ہیں۔ گل خان نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلیوٹ کے انداز میں انہیں سلام کیا اور بولا: ''السلام وعلیکم حاجی صاحب!'' انہوں نے بھی مانوس انداز میں گل خان کے سلام کا جواب دیا اور سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ گل خان نے میرا اُن سے تعارف کروایا تو میں نے آگے ہو کر اُن سے مصافحہ کیا' انہوں نے اشارے کے ذریعے ہمیں اندر آنے کے لیے کہا' ان کا فلیٹ بالکل خالی تھا' کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ دو تکیے رکھے ہوئے تھے' اس کے پاس سگریٹ کی ایک ڈبی اور لائٹر پڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے کمرے میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ انہوں نے رسمی انداز میں پہلے گل خان پھر اُس کے کاروبار اور پھر انڈیا میں موجود اُس کے بہن بھائیوں کی خیریت دریافت کی' اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا: ''میاں آپ کے والدین حیات ہیں؟'' میں نے اُنہیں بتایا کہ میری والدہ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہیں جب کہ والد کو ہیپاٹائٹس ''B'' کی شکایت ہے' انہوں نے دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے والدین کا سایہ تا دیر تمہارے سر پر قائم اور دائم رکھے! اُس کے بعد انہوں نے میری تعلیم کے بارے میں دریافت کیا' میں نے انہیں مختصر طور پر اپنی تعلیمی سرگرمی کے بارے میں بتایا' اُن کے پوچھنے پر میں نے اُنہیں بتایا کہ میرا ارادہ یہ ہی ہے کہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ تو وہ بولے: ''امریکہ میں تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو یہاں اسلام کی تبلیغ کا کام کریں۔'' میرے کان کھڑے ہوئے اور مجھے گزشتہ رات (FBI) کی خاتون تفتیشی افسر کی تنبیہ یاد آئی' کہ کوئی انتہاء پسند گروپ تمہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں شاید حاجی نزاکت بھی ایسے ہی کسی گروپ سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اچانک میرے ذہن میں ایک چھماکا ہوا' مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے جسے میں سادہ لوح ٹیکسی ڈرائیور سمجھ رہا ہوں' وہ گل خان بھی کسی تنظیم کا آلہ کار نہ ہو۔ اور اُس نے جان بوجھ کر حاجی نزاکت کی شخصیت کو افسانوی رنگ میں میرے سامنے پیش کیا ہو۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں افراد (FBI) یا اُس جیسی کسی اور سرکاری ایجنسی کے آلہ کار ہوں اور میرے ساتھ کوئی مصنوعی ڈرامہ کر کے میرے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ ابھی کل رات ہی میں

نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ میں اجنبی لوگوں سے ملنے میں احتیاط کروں گا اور واقف لوگوں سے بھی محدود تعلق رکھوں گا، لیکن چند گھنٹے گزارنے کے بعد میں اپنے اس عزم کو بھول کر ایک مرتبہ پھر اُسی غلطی کا مرتکب ہوا تھا' جس سے بچنے کی مجھے شدید ضرورت تھی' میرے ذہن میں آیا کہ میں مزید کچھ کہے اور سُنے بغیر یہاں سے اُٹھ کر چلا جاؤں' نیچے مجھے کوئی اور دوسری ٹیکسی مل جائے گی' اُس میں بیٹھ کر میں سیدھا اپنے ہوسٹل چلا جاؤں گا۔ حاجی نزاکت کو شاید میری بے چینی کا احساس ہوا' وہ بولے: ''میں آپ لوگوں کو اپنے دوست کی کہانی سناتا ہوں جسے ایک ایجنسی کے لوگ رات کے وقت اُس کی رہائش گاہ سے اُٹھا کر لے گئے تھے۔'' پھر انہوں نے پورا واقعہ سنانا شروع کیا' میں نے پہلے تو توجہ نہیں دی کیونکہ میں تو خود اُلجھن کا شکار تھا' لیکن اُس وقت مجھے اپنی ساری توجہ اُن کے بیان کی طرف مرکوز کرنی پڑی' جب انہوں نے یہ بتایا کہ اُن کا دوست تفتیش کے دوران فلم گلیڈی ایٹر دیکھنے لگا تو مجھے یہ لگا یہ سب واقعات تو وہی ہیں جو گزشتہ رات میرے ساتھ پیش آئے تھے۔ پھر اُس کے بعد انہوں نے تفتیش کے دوران کیے جانے والے سوالات' تفتیش کے آخر میں ہونے والے مکالمے کا ذکر کرنے کے بعد شہر کے بدنام علاقے میں اُس شخص کو چھوڑنے اور اُس شخص کے ہوٹل میں رات بسر کرنے کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ گل خان یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ حاجی صاحب کسی اور شخص کا واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے تو یہ معلوم تھا کہ یہ سب میری آپ بیتی ہے' میرے لیے یہ بات بہت حیران کن تھی کیونکہ اس نوعیت کا کوئی بھی واقعہ دو افراد کے ساتھ بالکل ایک ہی طرح ایک ہی ترتیب کے ساتھ پیش نہیں آ سکتا۔ تو کیا حاجی نزاکت واقعی کوئی روحانی شخصیت تھے اور انہوں نے اپنی روحانی طاقت کے ذریعے میرے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں جان لیا تھا' میرا ذہن تذبذب کا شکار ہو گیا تھا کیونکہ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی FBI کے ایجنٹ ہوں اور ایجنسی کے کسی آدمی نے گزشتہ رات کی ساری رپورٹ انہیں دی ہو تاکہ وہ اسی طرح مجھے متاثر کر سکیں۔

میرے یہ سب کچھ سوچنے کے دوران حاجی صاحب اپنے ایک اور دوست کا واقعہ شروع کر چکے تھے۔ جو اسلام اور مغرب کی کشمکش کے اسباب جاننے کے بارے میں ایک اسلام دشمن شخص سے ملتا ہے اور پھر اُن کے درمیان اس موضوع پر تفصیلی بحث ہوتی ہے۔ یہ واقعہ بھی میرے ساتھ پیش آیا تھا کیونکہ میں یہودی پروفیسر روبن سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو انہیں کسی ایجنسی کے اہلکار کے ذریعے پتا نہیں چل سکتی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ حاجی نزاکت میری توقع سے مختلف آدمی ہو سکتے ہیں۔ پھر مجھے گل خان کا بیان بھی یاد آیا جس میں اُس نے حاجی صاحب سے ظاہر ہونے والی چند غیر معمولی باتوں کا تذکرہ کیا تھا' میں نے سوچا کہ مجھے اس حوالے سے حاجی نزاکت سے کوئی سوال کرنا چاہیے۔ میں نے اُن سے پوچھا: ''آپ کیا سمجھتے ہیں کیا امریکہ میں اور دُنیا میں مسلمانوں کی صورتِ حال بہتر ہو جائے گی؟''

انہوں نے جواب دیا: ''یہاں سے بہت دور براعظم افریقہ میں ایک ملک ہے جس کا نام مراکش ہے' انگریزی میں اُسے مراکو کہا

جاتا ہے۔ مراکش میں آج سے پانچ سو سال پہلے ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں جن کا نام سیدی عبدالعزیز دباغ تھا' وہ دسویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں' انہوں نے اپنے روحانی مشاہدات بیان کرتے ہوئے یہ بات ذکر کی ہے کہ انہوں نے عیسائیت کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے' انہوں نے اس جملے میں علامتی زبان استعمال کی ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے آنے والے وقت میں دُنیا میں اُن لوگوں کو ظاہری عروج نصیب ہوگا جو عیسائیت کے پیروکار ہیں۔''

حاجی نزاکت نے جو بات بیان کی تھی اگر یہ اپنی جگہ درست تھی تو یہ بات واقعی حیران کن تھی کہ آج سے پانچ سو سال پہلے کوئی شخص یہ پیش گوئی کیسے کرسکتا تھا کہ آگے آنے والے زمانے میں عیسائی ریاستوں کو دنیا میں ظاہری غلبہ نصیب ہوگا۔ لیکن میں نے حاجی نزاکت صاحب کی بات کے درمیان دخل نہیں دیا' میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پہلے اپنی بات مکمل کرلیں۔ ''دنیا میں کوئی بھی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا' یہاں تک کہ جو چیونٹی اپنے بل میں حرکت کرتی ہے۔ درخت کی شاخ پر لگا ہوا جو پتا ہلتا ہے' یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے' آج دنیا میں امریکیوں اور عیسائیوں کو جو غلبہ حاصل ہے' وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت ہے۔''

مجھے ان کی اس بات سے اختلاف ہوا' میں نے اُن سے پوچھا: ''تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اللہ کی رضا سمجھ کر اس صورت حال کو قبول کرلینا چاہیے؟''

میرے اس سوال پر حاجی صاحب مسکرائے اور انہوں نے دریافت کیا: ''اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''سوا ارب کے لگ بھگ ہے۔'' انہوں نے دریافت کیا: ''ان سوا ارب لوگوں میں کتنے افراد ایسے ہیں جو عیسائیت کے اس غلبے کے خلاف جدوجہد کررہے ہیں؟ اور کتنے لوگ ایسے ہیں جو اس ساری صورتِ حال کو خواہی نخواہی قبول کیے ہوئے ہیں؟'' اُن کا یہ سوال اپنی جگہ پر ٹھیک تھا' واقعی اس وقت دنیا میں کہیں بھی مسلمان عیسائیوں کے غلبے کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں کررہے۔ بلکہ جو لوگ جہاد کے نام پر محدود پیمانے کی کارروائیاں کرتے ہیں اُن کا بھی بنیادی مقصد اسلام کا غلبہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے مخصوص علاقائی مفادات ہوتے ہیں۔ جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب ایسی کسی تنظیم کا سربراہ فوت ہوجاتا ہے تو جانشینی کے مسئلے پر تنظیم کے افراد مختلف گروہوں میں تقسیم ہوکر آپس میں برسرپیکار ہوجاتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ مختلف جہادی تنظیموں کے افراد اپنے جیسی دوسری تنظیموں سے لڑ پڑتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی ان ساری کوتاہی اور خامی کا ہرگز یہ مطلب بھی نہیں نکلتا کہ آپ اسے اللہ کی رضا سمجھ کر خاموش ہوکر بیٹھ جائیں گے۔ میں نے یہی بات حاجی صاحب کے سامنے دُہرائی تو وہ بولے: ''یہ میں نے کب کہا ہے کہ مسلمان چپ ہوکر بیٹھ جائیں۔ آؤ ہم مل کر اسلام کے غلبے کے لیے جدوجہد کرنے کا عہد کرتے ہیں۔'' میرے ذہن میں پھر وہی خیال آیا کہ حاجی نزاکت کسی انتہاء پسند گروہ کا نمائندہ ہوسکتا ہے' جو مجھ جیسے عام افراد کی برین واشنگ کرنے کے بعد اُنہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال

کرتے ہیں۔ میں نے اُن کو کوئی جواب نہیں دیا۔ میری خاموشی ہی میرا جواب تھی' یقیناً اس وقت میں اسلام کے غلبے اور عیسائیت کی پسپائی کے لیے جدوجہد کرنے کی بجائے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے وطن جا کر اعلیٰ ملازمت حاصل کر کے ایک خوش حال زندگی گزارنے کا خواہاں تھا اور مجھ جیسے امریکہ میں بسنے والے بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے تقریباً سب ہی مسلمان ایسی کسی جدوجہد کا حصہ بننے کی بجائے پرسکون ذاتی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ صرف چند ہی افراد تھے جو اسلام کے غلبے کا نعرہ لگاتے تھے لیکن اُن کے نزدیک اسلام کے غلبے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تنظیم کو حکومت مل جائے اور تنظیم کے قائدین حکومتی عہدوں پر فائز ہوں۔

میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ حاجی نزاکت نے مجھے مخاطب کیا: ''بابا آپ کیا کھائیں گے۔'' یہ ایک فطری سی بات ہے کہ جب کوئی آپ سے کھانے یا پینے کی کسی چیز کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو فوری طور پر آپ کے ذہن میں اسی چیز کا خیال آتا ہے جس کی آپ اُس وقت طلب محسوس کر رہے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ مروّت کے طور پر اپنی خواہش کا اظہار نہ کریں۔ مجھے مٹھائیوں میں پتیسا بہت پسند ہے۔ اس وقت جانے کیوں میرے دل میں پتیسا کھانے کی خواہش پیدا ہوئی' لیکن نیویارک میں تو اس کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا لیکن واشنگٹن میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی کوہ پیما ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرتے ہوئے راستے میں پڑاؤ کے دوران KFC کا برگر کھانے کی خواہش کرے۔ میں نے حاجی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اور بتایا کہ ابھی مجھے کسی چیز کی طلب نہیں ہے' انہوں نے میری بات سنی اور گل خان کو مخاطب کر کے بولے: ''آپ کو آج پتیسا نہ کھلائیں؟'' گل خان بیچارا سادہ لوح عقیدت مند تھا' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ حاجی صاحب نے اُسے ہدایت کی کہ الماری میں ایک لفافہ موجود ہے وہ نکال کر لے آؤ۔ پورے کمرے میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ گل خان نے دیوار کی الماری کا دروازہ کھولا اور ایک لفافہ اُٹھا کر لے آیا۔ اس نے لفافے میں سے ایک ڈلی مجھے نکال کر دی' ایک حاجی صاحب کو پیش کی اور ایک خود کھانے لگا۔ میرے سامنے پھر ایک سوالیہ نشان آ گیا۔ کیا حاجی نزاکت کسی پراسرار طاقت کا مالک ہے؟ یا یہ بھی کوئی اتفاق ہے۔ ''یہ مٹھائی ہمیں کس نے کھلائی ہے؟'' حاجی نزاکت نے ہم سے سوال کیا' ہم نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی بولے: ''اللہ تعالیٰ نے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد انہوں نے پھر بات شروع کی: ''یہ ایک ہندوستانی مٹھائی ہے' جو یہاں سے ہزاروں میل دور کسی جگہ پر بنائی گئی ہے۔ سات سمندر پار کا سفر کر کے وہ اتنے بڑے امریکہ میں ہمارے سامنے آ گئی اور ہم نے اسے کھایا۔ کیوں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ رزق ہمارے مقدر میں لکھا تھا۔ اسی طرح امریکہ میں کوئی چاکلیٹ کوئی ٹافی بنتی ہے جسے دنیا کے دوسرے کنارے پر موجود آسٹریلیا یا جاپان میں رہنے والا کوئی بچہ کھا لیتا ہے۔ کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے نصیب میں لکھی تھی۔ آپ نے غور کیا گھر میں بیٹھے ہوئے ایک بچے کو اللہ تعالیٰ نے کس طرح رزق فراہم کیا' پھر اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ وہ رزق اس کی بنیادی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اضافی لذت کے حصول کے لیے ہے۔'' حاجی نزاکت نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا تھا' وہ ہماری عام روزمرہ

زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ہم نے یہ کبھی غور ہی نہیں کیا کہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت اور قدرت کارفرما ہے۔ لیکن میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ اُنھوں نے یہ مثال کیوں بیان کی ہے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا: ''اس مثال کا مقصد کیا ہے؟'' تو وہ بولے: ''میں آپ کو یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ رزق' اس کے اسباب اور وسائل کی عطاء اور تقسیم اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ اُس نے کسے کیا دینا ہے۔ ہمارا محدود علم اور ہماری محدود سوچ اُس کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔'' میں نے کہا: ''کوئی بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا۔'' وہ بولے: ''ہر شخص اس بات کا انکار کر دیتا ہے۔'' میں نے دریافت کیا: ''وہ کس طرح؟'' وہ بولے: ''ہمیں مٹھائی کھانے کی خواہش تھی' وہ اُس نے ہمیں دے دی اور ہم اس کی حکمت کو مان لیں گے۔ لیکن جب وہ ہماری خواہش کے مطابق کوئی چیز ہمیں نہیں دیتا یا ہماری کوئی پسندیدہ چیز ہم سے واپس لے لیتا ہے تو اس وقت ہم اس کی حکمت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُس وقت ہمارے سامنے ہماری اپنی پسند ہماری اپنی خواہش مقدم ہوتی ہے۔'' اُن کی اس بات پر میرے ذہن میں جھماکا ہوا' میری بھی تو یہ خواہش تھی کہ میں امریکہ میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کروں اور پھر کسی بین الاقوامی ادارے میں اچھی پوسٹ پر فائز ہو کر خوش حال زندگی بسر کروں۔ اگر میرا یہ خواب پورا نہ ہوتا تو مجھے خدا سے اتنے شکوے ہونے تھے۔ حالانکہ اگر میری یہ خواہش پوری نہ ہوتو دنیا کے نظام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اگر کسی شخص کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو اس میں کیا حکمت ہوگی۔ حاجی نزاکت نے ایک عام سی مثال بیان کر کے میرے ذہن پر موجود ایک بڑا بوجھ اُتار دیا تھا۔ اب مجھے اُن میں کچھ دلچسپی محسوس ہونا شروع ہوئی۔ ''اللہ تعالیٰ کے نظام کو سمجھنا اور اس کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔'' میری اس بات پر حاجی نزاکت نے کہا: ''اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اُس کی گنجائش سے زیادہ پابند نہیں کرتا۔ اس لیے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہماری صلاحیت کا دائرۂ کار کیا ہے اور ہم اپنی صلاحیتوں کو مثبت طریقے سے کیسے انجام دے سکتے ہیں۔'' مجھے ایک مرتبہ پھر یہ محسوس ہوا کہ شاید حاجی نزاکت اب مجھے کسی پر ہجوم جگہ پر کوئی سیاہ بیگ رکھ کر آنے کی ہدایت کرے گا۔ لیکن اُن کی اگلی بات میری توقع کے برخلاف تھی۔ ''حضور نبی اکرمؐ نے ساری دنیا کے لوگوں کو مسلمان نہیں کیا تھا۔ آپ نے اپنی ظاہری حالات' اسباب اور وسائل کے مطابق ایک مخصوص خطے سے تعلق رکھنے والے چند افراد کو تبلیغ کی' اُن لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور پھر آپ باقی دنیا تک تبلیغ کا کام اپنے پیروکاروں کے سپرد کر کے اپنے پروردگار کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ جبکہ ہمارے ہاں تبلیغ کرنے والے لوگ یہ بات اپنے اوپر فرض سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کے ہر فرد تک بنفسِ نفیس اسلام کی دعوت پہنچائیں گے۔'' مجھے ان کی اس بات سے اختلاف محسوس ہوا۔ ''اگر کوئی اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے تو اس پر آپ کو اعتراض کیا ہے؟'' وہ میری بات پر مسکرائے۔ ''دعوت اور تبلیغ کا کام کرنے کے لیے سب سے پہلی بنیادی ضرورت اخلاص ہے۔ دوسری بنیادی ضرورت کردار کی پختگی ہے اور تیسری بنیادی ضرورت تبلیغ کا طریقہ کار ہے۔''

مجھے اُن کی بات میں کچھ ابہام محسوس ہوا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اسلام کی دعوت اور تبلیغ کا کام کرنے والے افراد اخلاص کے ساتھ یہ عمل سرانجام نہیں دے رہے؟'' میرا لہجہ شاید کچھ تیز تھا۔ لیکن انہوں نے میری بات کا بُرا نہیں مانا اور بولے: ''ہمیں کسی شخص یا تنظیم کے خلوصِ نیت پر شک کرنے کا حق نہیں ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا کام کرنے والے عظیم افراد داتا صاحب، خواجہ صاحب، بابا صاحب اور دیگر بزرگانِ دین میں ہمیں جو روحانیت، جو اخلاص، جو پرہیزگاری نظر آتی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی آج کہیں نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ تبلیغِ دین کے وہ نتائج ہمیں نظر نہیں آتے جو نظر آنا چاہئیں۔'' اس مرتبہ بھی مجھے اُن کی رائے سے اختلاف ہوا۔

''میں یہ سمجھتا ہوں ایسا نہیں ہے۔'' گل خان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ اسے میرا اختلاف کرنا پسند نہیں آیا۔ ''آپ نے جن بزرگوں کا ذکر کیا، ہندوپاک میں اسلام کی تبلیغ کے حوالے سے انہوں نے عظیم خدمات انجام دی ہیں لیکن آپ یہ دیکھیں کہ تبلیغ کرنے کے حوالے سے ان حضرات کا طرزِ عمل صحابہ کرام سے مختلف تھا۔ صحابہ کی زندگیوں کا زیادہ تر حصہ جہاد کرتے ہوئے گزرا۔ ان میں غیر مسلم سلطنتوں کے علاقے مسلمانوں نے فتح کیے وہ لوگ مسلمانوں کے ماتحت بنے اور پھر اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن صوفیا کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک مکمل ہندو معاشرے میں آئے، انہوں نے اپنی روحانی قوت کا مظاہرہ کر کے کرامات دکھا کر لوگوں کے ذہن تسخیر کیے، لیکن آج کا دور مختلف ہے۔ اس کے تقاضے مختلف ہیں۔'' وہ دونوں بڑے غور سے میری بات سنتے رہے، میں خاموش ہوا تو حاجی نزاکت نے دریافت کیا: ''آپ کیا سمجھتے ہیں آج کے دور کے تقاضے کیا ہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''ہمارا زمانہ ملٹی نیشنل اور ملٹی کلچرل معاشروں کا زمانہ ہے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد و نظریات، رسوم و رواج پر کاربند رہتے ہوئے ایک ہی معاشرے میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ آج کے دور میں جہاد عملی طور پر باقی نہیں رہا۔ آج اگر آپ لوگوں کے سامنے کوئی کرامت دکھاتے ہیں تو وہ آپ سے متاثر ہونے کی بجائے اس کا سائنسی تجزیہ کرنے بیٹھ جائیں گے۔'' میری اس بات پر حاجی نزاکت صاحب مسکرائے، میں یہ سمجھا کہ شاید وہ کچھ کہیں گے لیکن وہ خاموش رہے تو میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے، آپ ذرائع ابلاغ کی طاقت کے ذریعے لوگوں کے ذہن بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے کسی ریاضت یا مجاہدے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مجھے لگا کہ شاید میرا آخری جملہ میرے مادیت پسند ہونے کا عکاس ہے، لیکن اب وہ میرے منہ سے نکل چکا تھا اسے لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ ''اب اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کی رائے سے اختلاف کروں گا۔'' حاجی نزاکت نے نرم لہجے میں کہا، میں نے جواب میں صرف سر ہلایا، جس کا مطلب یہی تھا کہ آپ اپنا موقف بیان کریں۔ ''جتنے بھی بانیانِ مذاہب ہیں ان کا مذہب ذرائع ابلاغ کے نتیجے میں نہیں پھیلا اور ان حضرات کی نمایاں خصوصیت ان کی ذاتی ریاضت اور مجاہدہ تھا۔'' میں نے کہا: ''میں نے جوشِ کلام میں شاید غلط بات کہہ دی ہے''

میں یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ دین کی تبلیغ کے لیے ہمیں جدید ذرائع استعمال کرنے چاہئیں۔'' اب کی بار گل خان نے میری بات کا جواب دیا: ''حضرت داتا گنج بخشؒ یا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کون سے ذرائع استعمال کیے تھے؟'' حاجی نزاکت صاحب نے بات آگے بڑھائی: ''جب تک اللہ کا حکم نہ ہو اُس وقت تک اسباب کچھ کام نہیں آتے' انسان کو اسباب ضرور استعمال کرنے چاہئیں' لیکن یہ لازم نہیں ہے کہ نتیجہ آپ کی خواہش کے مطابق ہوگا لیکن جب ہم اسباب کی بات کرتے ہیں تو اسباب کے مراتب میں فرق پایا جاتا ہے۔ کوئی ایک سبب زیادہ طاقتور ہوتا ہے' اس کا نتیجہ زیادہ بہتر سامنے آتا ہے۔ کوئی دوسرا سبب کمزور ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ نسبتاً محدود ہوتا ہے۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ ایک ہیوی جنریٹر زیادہ مقدار میں بجلی پیدا کرتا ہے' جس سے زیادہ فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک چھوٹا جنریٹر تھوڑی بجلی پیدا کرتا ہے' جس سے تھوڑے پیمانے پر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ علم' عمل' روحانیت' ریاضت' مجاہدہ' یہ سب توانائی کے ذریعے ہیں۔ اور یہ توانائی جب انسان کے کردار سے خارج ہوتی ہے تو دوسروں کو اپنا اسیر کر لیتی ہے۔'' مجھے ان کی اس بات سے پھر اختلاف ہوا۔

لیکن میں نے اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا اور بات بدل دی۔ ''آپ مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' یہ میرا ہی نہیں آج کے دور میں مغرب میں بسنے والے بلکہ دنیا میں رہنے والے ہر مسلمان کا بنیادی سوال تھا۔ عام طور پر ہمیں اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے: آپ پانچ وقت نماز ادا کریں۔ حلال رزق کمائیں۔ حرام سے بچیں' لیکن بہت سے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے۔ میرے سوال کے جواب میں حاجی صاحب بولے: ''کیسی عجیب بات ہے کہ جب کسی نوجوان کی شادی ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں پہلے سے اس بات کا خاکہ موجود ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بچے کو پڑھا لکھا کر کیا بنانا ہے' لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس نے خود کیا کرنا ہے۔''

یہ بات واقعی ٹھیک تھی۔ مجھ سمیت دنیا کے اکثر مسلمان افراد کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہیں عملی طور پر کیا کرنا چاہیے۔ ہم جیسے افراد زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہفتے یا مہینے بعد کسی مذہبی یا معاشرتی اجتماع میں بیٹھ کر مغربی معاشرے میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر تبصرہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد حاجی نزاکت صاحب کے ساتھ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں' پھر ہم نے ان سے اجازت لی اور وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گئے۔ نیچے آ کر ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد گل خان نے مجھ سے دریافت کیا: ''آپ کو باباجی کیسے لگے؟'' میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے جواب دیا: ''مجھے وہ پسند آئے ہیں۔'' حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں اب بھی اُن کے بارے میں تردد کا شکار تھا' مجھے اب بھی یہ واضح نہیں ہو سکا کہ وہ کسی تنظیم کے آلۂ کار تھے' ابھی ہم وہاں سے روانہ ہوئے تھے کہ میرے موبائل پر کسی انجان نمبر سے کال آنے لگی' میں نے اُسے ریسیو کیا تو دوسری طرف FBI کا آفیسر اینتھونی تھا' اس نے اپنا تعارف کروا کر کہا: ''مجھے لگ رہا ہے کہ اب تم امریکہ میں مزید قیام نہیں کرنا چاہتے۔''

میں نے اُس سے دریافت کیا کہ اُسے کس بات پر ایسا محسوس ہوا ہے؟ تو اُس نے جواب دیا: ''تم جس شخص سے مل کر آ رہے ہو' وہ خاصی مشکوک حیثیت کا مالک ہے اور طویل عرصے سے ایجنسیوں کی نظر میں ہے۔'' اس کی اس بات پر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ کوئی خفیہ اہل کار میری نگرانی پر مامور کیا گیا ہوگا۔ اب یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں زیرِ نگرانی آنے کے فوراً بعد اتفاقیہ طور پر ایک ایسے شخص سے ملنے چلا گیا تھا کہ جو خود نمایاں طور پر ایجنسیوں کی نظر میں تھا۔ لیکن حاجی نزاکت کے پاس بیٹھنے کا مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اب مجھے یہ یقین تھا کہ آئندہ جو بھی ہوگا' اللہ کی مرضی سے ہوگا۔ مجھے اب یہ خوف نہیں تھا کہ مجھے امریکہ سے ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ اس لیے میں نے کسی خوف کے بغیر انتھونی کو جواب دیا: ''مجھے یہ اُمید نہیں ہے کہ تم میری بات کو درست سمجھو گے لیکن پھر بھی میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ آج میں جس شخص سے ملنے کے لیے گیا وہ پہلے سے تمہاری نظر میں مشکوک ہے۔''

اس کی آواز آئی: ''اس طرح کے اتفاقات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک امریکہ کی سلامتی سب سے اہم ہے۔ میں تمہیں پھر تنبیہ کر رہا ہوں کہ تم اپنی سرگرمیاں محدود کر لو۔'' میں نے اسے جواب دیا: ''تمہاری تنبیہ کا شکریہ' میں آئندہ محتاط رہنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے گڈ بائے کہہ کر کال ختم کر دی۔ میری اس کے ساتھ گفتگو چونکہ انگریزی میں ہو رہی تھی' اس لیے گل خان کو پتہ نہیں چل سکا لیکن شاید میرے چہرے کے تاثرات سے اسے کچھ اندازہ ہوا کہ میں وہ فون سن کر پریشان ہو گیا ہوں۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا: ''خیر ہے بھائی صاحب؟'' میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور پھر اسے حقیقت حال بتانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اگر حاجی نزاکت ایجنسیوں کی نظر میں تھا تو یقیناً کسی ادارے کے اہلکاروں نے گل خان سے بھی پوچھ گچھ کی ہوگی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گزشتہ رات ایف بی آئی والے مجھے اٹھا کر لے گئے تھے اور انہوں نے اس طرح مجھ سے تفتیش کی۔ تمام جزئیات بیان کرنے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ ابھی مجھے ایف بی آئی سے اسی افسر کا فون آیا تھا اور اس نے مجھے یہ کہا ہے کہ تم جس شخص سے مل کر آ رہے ہو وہ ایک مشکوک شخص ہے۔ گل خان میری ساری بات پوری توجہ سے سنتا رہا' جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولا: ''ہم آپ کو اس بات کا ضمانت دیتا ہے کہ آپ کا مرضی کے بغیر کوئی آپ کو امریکہ سے نہیں نکال سکے گا۔'' اس کا لہجہ اس طرح پُر یقین تھا جیسے وہ امریکہ کا وزیر خارجہ یا وزیر دفاع ہو۔ اس کے پُر یقین لہجے پر مجھے ہنسی آ گئی تو اُس نے میری ہنسی کا سبب دریافت کیا۔ ''تم کس بنیاد پر یہ ضمانت دیتے ہو؟'' میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اُلٹا اس سے سوال کر دیا تو وہ بولا: ''اگر ممکن ہوتا تو امریکہ کا پولیس سب سے پہلے مجھے یہاں سے نکالتا چونکہ یہاں حاجی صاحب کے پاس سب سے زیادہ میرا آنا جانا ہے اور میں امریکہ میں غیر قانونی طور پر رہ رہا ہوں' آپ کیا سمجھتے ہو امریکی ایجنسیوں نے مجھے نظر انداز کر دیا ہوگا؟'' اس نے گاڑی چلاتے ہوئے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے اسے اپنی توجہ سامنے کی طرف مبذول رکھنے کی ہدایت کی' کیونکہ ایسی کوئی لاپرواہی کسی حادثے کا سبب بھی

بن سکتی ہے۔ پھر میں نے اس کی بات پر غور کیا تو وہ کافی حد تک ٹھیک تھی‘ میں نے اس سے دریافت کیا: ’’تم کیا سمجھتے ہو ایجنسی والوں نے تمہیں گرفتار کیوں نہیں کیا؟‘‘ تو وہ بولا: ’’یہ سب اللہ کی مرضی اور باباجی کی مہربانی سے ہے۔‘‘ وہ ایک سادہ لوح ضعیف الاعتقاد شخص تھا‘ اس لیے میں نے اس کی بات سے اختلاف نہیں کیا‘ کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد میں نے اسے ہاسٹل کا پتہ بتاتے ہوئے یہ ہدایت کی کہ وہ مجھے ہاسٹل تک پہنچادے۔ ہاسٹل کے سامنے اترتے ہوئے جب میں نے اسے طے شدہ رقم دینا چاہی تو اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا اور بولا: ’’اس کا ضرورت نہیں ہے‘ آپ ہمارا بھائی اہے‘ آپ کو جب بھی ضرورت ہو ہمیں فون کر لینا۔‘‘ میں نے اس کا نمبر نوٹ کیا اور اسے رخصت کر کے ہاسٹل میں اپنے کمرے میں آ گیا‘ کمرے میں آ کر سب سے پہلے میں نے آنسرنگ مشین آن کی تو پہلا پیغام پاکستان سے میری چھوٹی بہن کا تھا۔ اس نے یہ فرمائش کی تھی کہ جب مجھے فراغت ملے تو میں گھر فون کر کے امی کے ساتھ بات کروں‘ کیونکہ وہ میرے بغیر بہت اداس تھیں۔ میں نے بٹن دبا کر اگلا پیغام سننا شروع کیا تو وہ فریڈرک کا تھا‘ اس نے یہ پیغام دیا تھا کہ اس کی دوست جولیا مجھ سے ملنا چاہتی ہے‘ آخر میں اس نے جولیا کا نمبر بتا کر کہا کہ میں اس نمبر پر جولیا سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ میں نے بٹن دبا کر اگلا پیغام آن کیا‘ فون کے سپیکر سے آواز اُبھری: ’’ہیلو! السلام علیکم! رضا میں عذرا بات کر رہی ہوں۔‘‘ یہ الفاظ کسی بم کے دھماکے کی آواز کی طرح میری سماعت سے ٹکرائے‘ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگوں نے میرا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے سہارا لینے کے لیے ٹیلی فون اسٹینڈ کو پکڑا‘ ’’میں سان فرانسسکو میں ہوں‘ اگر تمہارا دل آمادہ ہو اور ذہن اجازت دے تو تم اس نمبر پر فون کر لینا۔‘‘ اس کے بعد اس نے اپنا نمبر بیان کیا‘ اسے دُہرایا اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا‘ آج کتنے برس کے بعد میں نے یہ آواز سنی تھی‘ ٹھیک چھ برس چار ماہ تیرہ دن کے بعد‘ میں کسی فلم کا کردار نہیں تھا جو گھنٹوں اور منٹوں کا بھی حساب رکھتا‘ لیکن دن مجھے یاد تھے اور میں روزانہ ان میں ہونے والے اضافے کو لاشعوری طور پر کئی مرتبہ دُہرا لیتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے احساسات منجمد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے ہاسٹل کے ایڈمنسٹریشن بلاک میں فون کر کے آپریٹر سے کہا: ’’مجھے طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔‘‘ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میرا بلڈ پریشر تیزی سے ہائی ہو رہا ہے‘ یا لو ہو رہا ہے۔ میں نے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے جا کر دروازے کی کنڈی کھولی اور پھر وہیں پہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا‘ چند ہی لمحوں میں میرا ذہن غنودگی کی آغوش میں چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ہاسٹل کے اس کمرے میں تھا جو ابتدائی طبی امداد کے لیے مخصوص تھا۔ میرے سرہانے ایک ڈاکٹر اور اس کے ساتھ ہاسٹل کی انتظامیہ کا ایک فرد بھی موجود تھا۔ میرے آنکھیں کھولنے پر ڈاکٹر میرے اوپر جھک کر بولا: ''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے نحیف سی آواز میں اسے جواب دیا: ''مجھے کچھ زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔'' تو اس نے بتایا کہ ہم نے تمہیں ڈرپ لگا دی ہے کہ مزید آدھے گھنٹے تک اس کا اثر ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا' ابھی تم سونے کی کوشش کرو' چند لمحوں بعد میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا' پھر میری آنکھ کھلی تو دیوار کی گھڑی تین بجا رہی تھی' مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ صبح کے تین بجے ہیں یا دوپہر کے' کچھ دیر بعد میں دوبارہ سو گیا' پھر میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ فام نرس میرے سرہانے کھڑی ہوئی کچھ نوٹ کر رہی تھی۔ میں نے اس مرتبہ اپنی طبیعت کو پہلے سے بہتر محسوس کیا۔ تو میرا جی چاہا کہ میں اُٹھ کر بیٹھ جاؤں۔ میں نے نرس سے دریافت کیا: ''کیا میں اُٹھ کے بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا' پھر اس نے میرے بیڈ کے بائیں طرف موجود ایک بٹن دبایا تو سرہانے والا حصہ اوپر ہونے لگا' میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو اس پہ چھ بج کے پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر نرس نے بتایا کہ گزشتہ شام طبی عملے کے افراد مجھے یہاں لے کر آئے تھے' اس وقت میرا بلڈ پریشر خطرناک حد تک نیچے پہنچ چکا تھا۔ ابتدائی طبی امداد کے نتیجے میں وہ نارمل ہونا شروع ہوا۔ اس کے بعد صرف دوا کے زیرِ اثر میں اتنے گھنٹوں تک سویا رہا ہوں اور اب اگلے دن صبح کے سات بجنے والے ہیں۔ ڈاکٹر کے بیان کے مطابق میری یہ کیفیت کسی اچانک خلافِ توقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے نرس سے دریافت کیا کہ کیا ابھی مجھے مزید یہاں رہنا ہوگا؟ تو اس نے بتایا: ''ڈاکٹر کا یہ کہنا ہے کہ اگر میں یہ محسوس کروں کہ آسانی سے چل پھر سکتا ہوں تو مجھے جانے کی اجازت دے دی جائے۔'' میں نے اسے بتایا کہ میں خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میں آسانی سے چل پھر سکوں گا۔ نرس نے میرے سرہانے لگی ہوئی مشین سے میرا بلڈ پریشر' دل کی دھڑکن وغیرہ سے متعلق چیزیں نوٹ کیں۔ اور مجھے وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کر کے وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا' اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں فارمیسی سے یہ دوا لے کر نسخے کے مطابق اسے استعمال کروں اور ڈاکٹر کی میرے لیے یہ ہدایت ہے کہ میں آئندہ چند دن تک شراب نوشی' ڈراؤنی فلمیں اور ایسی کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے سے گریز کروں جو کسی انسان کے ذہن پر منفی طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا' یہ جگہ ہاسٹل کے ایڈمنسٹریشن بلاک کا ایک حصہ تھی' جسے ہاسٹل میں رہنے والے طالب علموں کی ابتدائی طبی امداد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ امریکی معاشرے کی ہزار خوبیوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ لوگ آپ کے ظاہری حلیے کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے' اس لیے میں نے کمرے میں آ کر اپنی ضروریات کی چیزیں اُٹھائیں اور منہ ہاتھ دھوئے بغیر یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔

اپنے ڈیپارٹمنٹ میں پہنچ کر نوٹس بورڈ کو دیکھا تو اس پر یہ تحریر تھا کہ آج ایک کلاس ڈاکٹر جوڈی تھرمن لیں گی' ان کا لیکچر عالمی عدالتِ انصاف اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں ہوگا۔ جبکہ دوسرا لیکچر پروفیسر جارج کلونے کا ہوگا جو اسلامی اصولِ قانون کی تاریخ کے بارے میں ہوگا۔ دونوں موضوعات اہم تھے۔ ڈاکٹر جوڈی تھرمن دیکھنے میں ساٹھ برس کی لگتی تھیں' شاید اس کی عمر اس سے زیادہ ہو'اس نے بڑے نپے تلے الفاظ میں عالمی عدالتِ انصاف کا تعارف کرایا' اس کے پسِ منظر کی وضاحت کی' اس کے قیام کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ اس کا طریقہ کار بیان کیا' اس کا لیکچر سننے کے دوران مجھے ایک خیال آیا' میں نے اسے جلدی سے اپنی کاپی پہ نوٹ کر لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ بعد میں میں اس نکتے پر مزید غور وفکر کروں گا۔ ڈاکٹر جوڈی تھرمن کا لیکچر ختم ہوا' اگلا لیکچر ڈیڑھ گھنٹے کے وقفے کے بعد تھا' اس لیے میں کینٹین میں آ کر بیٹھ گیا۔ بیرے کو کافی لانے کا کہہ کر میں نے اپنی نوٹ بک کھولی تو پہلے ہی صفحے پر وہ نکتہ تحریر تھا۔ جس کے بارے میں میں نے غور وفکر اور سوچ بچار کرنا تھا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ چند برس پہلے اخبارات میں یہ بات شائع ہوئی کہ ایک برادر اسلامی ملک میں موجود نبی اکرمؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ کی قبر مبارک کو شہید کر دیا گیا تو پاکستان میں کئی دنوں تک اس حوالے سے عوامی احتجاج کا سلسلہ جاری رہا۔ دیگر اسلامی ممالک میں بھی اس حوالے سے غم اور غصے کا اظہار کیا گیا' لیکن یہ کیسی حیران کن بات ہے کہ سڑکوں پر ٹائر جلانے والوں' پولیس پر پتھراؤ کرنے والوں' لوگوں کی گاڑیوں کے شیشے توڑنے والوں اور ان سب باتوں کی ترغیب دینے والوں یا کم از کم ان کی پشت پناہی کرنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اس اہم مذہبی مسئلے پر عالمی عدالتِ انصاف کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور وہاں یہ درخواست کریں کہ حضرت محمدؐ دنیا کے ایک بڑے مذہب کے پیشوا ہیں۔ اس حوالے سے ان کی والدہ کی قبر ایک اہم تاریخی حیثیت رکھتی ہے تو کسی حکومت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ایک اہم تاریخی یادگار کو اس طرح بے نام ونشان کر دے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عالمی عدالتِ انصاف اس مقدمے کی سماعت کرتی ہے یا نہیں' وہ جو فیصلہ دیتی ہے متعلقہ ملک کی حکومت اسے تسلیم کرتی ہے یا تسلیم نہیں کرتی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کسی رونما ہونے والے واقعے کے ردِعمل میں وہ طرزِ عمل اختیار کیوں نہیں کرتے جو دنیا کی مہذب اقوام کا وطیرہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مہذب دنیا کے بارے میں مسلمانوں کی تمام تر سوچ اور معلومات محدود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر اسلامی ممالک کا نظامِ تعلیم وہ شعور پیدا نہیں کرتا جس کی مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا میں بین الاقوامی سطح کا کوئی لیڈر' کوئی دانشور' مفکر' شاعر' سفارت کار' مصنف' صحافی' نشریاتی ادارہ یعنی ریڈیو' ٹی وی' اشاعتی ادارہ کسی مسلمان کا نہیں ہے۔ صرف ایک الجزیرہ ٹی وی ہے' جس کا مقصد اسامہ بن لادن' ایمن الظواہری جیسے جہادی لیڈروں کی ویڈیو ٹیپیں جاری کرنا ہے۔ میں اس طرح کے خیالات میں گم تھا کہ کوئی میرے قریب آ کے رکا' میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ جولیا تھی' فریڈرک کی دوست' ایک ذہین اور سمجھدار عورت۔ ''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' اس نے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''کیسے ہو؟'' اس نے خوش دلی سے

دریافت کیا' تو میں نے بتایا کہ "ٹھیک ہوں۔" "لیکن تمہارے چہرے سے تو یہ نہیں لگ رہا۔" شاید عورتیں مردوں سے زیادہ نگاہ شناس ہوتی ہیں۔ اپنے ظاہری حلیے سے وہ ایک مست ملنگ قسم کی لڑکی محسوس ہوتی تھی' یوں جیسے ابھی کہیں سے چرس بھرا ہوا سگریٹ پی کر آئی ہو گی یا پھر ابھی جا کر پی لے گی' لیکن اس سے ہونے والی سابقہ ملاقات میں مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی ذہین لڑکی ہے۔ شاید گزشتہ رات کی طبیعت کی خرابی نے میرے چہرے پہ اپنا کوئی نقش چھوڑ دیا تھا' جو وہ اس یقین سے پوچھ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید مجھے ابھی کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں گزشتہ رات اپنی طبیعت خراب ہونے کے بارے میں بتایا' تو وہ تشویش سے بولی: "پھر تو تمہیں آج یونیورسٹی نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں نے اسے بتایا کہ اگر میں ہاسٹل کے کمرے میں تنہا رہتا تو یہ میرے لیے زیادہ مشکل ہوتا' اس لیے میں یونیورسٹی آ گیا ہوں تاکہ کچھ ذہن بٹ جائے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں اس وقت تنہائی سے خائف ہوں لیکن وہ فوراً سمجھ گئی۔ "کیا تم اس وقت کسی کا ساتھ چاہ رہے ہو؟ اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار سکتی ہوں۔" امریکیوں کی ہزار خامیوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ کسی کو نظر انداز کر دیں تو بیچ چوراہے کے مرتے ہوئے آدمی کی طرف بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے اور جب کسی پہ مہربان ہو جائیں تو اس کا ساتھ بالکل نہیں چھوڑتے' خواہ یہ ساتھ چند دن کا ہی کیوں نہ ہو' میرا مزاج ایسا نہیں تھا کہ میں لڑکیوں کو اپنی دوست بناتا پھروں' ایف بی آئی کی خاتون افسر نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہا تھا کہ میں درحقیقت عورتوں سے خوفزدہ ہوں۔ اب میں اسے مشرقی روایات کی پاسداری قرار دوں یا کچھ اور' حقیقت یہی تھی کہ میں شاید واقعی عورتوں کے قرب سے گھبراتا تھا۔ میں نے جولیا کی پیشکش پہ غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مجھے یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے گزشتہ دو دن کے دوران پیش آنے والے واقعات ترتیب کے ساتھ اس کو بتائے۔ ایف بی آئی کی تفتیش' اس کے دوران اپنی رات بھر کی بے آرامی' ذہنی دباؤ' حاجی نزاکت کی پراسرار شخصیت' اپنا ایف بی آئی کے زیر نگرانی ہونا' ان سب باتوں کا مشترکہ دباؤ اور پھر ایسے عالم میں عذرا کا فون۔ جولیا نے میری پوری بات بڑی توجہ سے سنی اور بولی: "ایف بی آئی والوں کے بارے میں جو تم نے بتایا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی وہ صرف احتیاط کے طور پر تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں' ان کا رویہ تمہارے ساتھ معاندانہ نہیں ہے' اس لیے تم اس حوالے سے فکرمند نہ ہو۔" لیکن میں اسے یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ جب آپ کو ہر وقت یہ احساس ہو کہ کچھ نادیدہ آنکھیں ہر وقت آپ کی نگرانی کر رہی ہیں اور آپ کو یہ اندیشہ بھی ہو کہ اسی نگرانی کے نتیجے میں آپ سے متعلق بعض افراد کے لیے بلکہ خود آپ کے لیے بھی ناپسندیدہ صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے تو لازمی سی بات ہے کہ آپ خود کو بے آرام محسوس کریں گے اور یہ بے آرامی آخر کار آپ کے اعصاب پر سوار ہونے لگے گی۔ میرے ان خیالوں سے بے خبر وہ اپنی بات کہے جا رہی تھی۔ "جہاں تک تم نے اس پراسرار شخص کا تذکرہ کیا ہے تو ایسے مشکوک قسم کے افراد سے نہ ملنا بہتر ہے۔ وہ بھی خاص طور پر ایسی صورتِ حال میں جب تمہارے ساتھ وہ شخص بھی خفیہ ایجنسیوں کی نظر میں

ہو۔ آج کی دنیا میں جو حالات چل رہے ہیں‘ ایسے میں کسی پر اعتماد کرنا اعلیٰ درجے کی بے وقوفی ہوتی ہے۔‘‘ میرے جی میں آئی کہ میں اس سے کہوں کہ پھر تو تمہیں مجھ پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے‘ لیکن میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ کہیں وہ میری اس بات کا بُرا نہ مان لے‘ آخر وہ اس وقت میری ہمدردی میں میری خاطر وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ تو مجھے بھی اسکے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ویسے بھی وہ ایک ذہین لڑکی تھی اور ذہین لوگ حساس بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اس وقت کسی ہمدرد اور غمگسار شخص کی ضرورت تھی۔

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں وہ مجھے سنا کے روئے

’’تم اپنے آپ کو صرف اپنی تعلیمی سرگرمیوں تک محدود رکھو کیونکہ ابھی تک دہشت گردی کی منصوبہ بندی کے جو واقعات سامنے آئے ہیں‘ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ملوث پائے گئے ہیں جو یونیورسٹی سطح کے اداروں میں زیرِ تعلیم ہوتے ہیں۔ اور ہاں یہ عذرا کون ہے؟‘‘ عذرا کیونکہ انگریزی کا لفظ نہیں ہے‘ اس لیے محض یہ نام سن کر جولیا کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ یہ کسی مرد کا نام ہے یا خاتون کا۔ ’’عذرا میری جولیٹ ہے۔‘‘ مجھے تعارف کے لیے یہی ترکیب موزوں محسوس ہوئی۔ میں نے مزید وضاحت کی: ’’میں رومیو نہیں ہوں لیکن وہ جولیٹ ہے۔‘‘ وہ میری بات سن کے ہنسی ’’اگر تم رومیو نہیں ہو تو آنسرنگ مشین پر محض اس کی آواز سن کے ہوش و حواس کیوں کھو بیٹھے تھے؟‘‘ اس نے امریکیوں کے روایتی انداز میں ہاتھ آگے بڑھا کر میرے بازو پہ چٹکی کاٹتے ہوئے کہا تو میں نے بدک کر بازو پیچھے کیا‘ یوں جیسے اس نے میرا بازو پکڑنے کی کوشش کی ہو اور میں نے جھٹکے سے بازو چھڑایا ہو‘ میری یہ حرکت لاشعوری تھی لیکن امریکی روایات کے اعتبار سے خلاف تہذیب تھی۔ ’’اوہ! تو تم اپنی اس جولیٹ کی وجہ سے عورتوں سے بھاگتے ہو‘ ڈرو نہیں میرے چھونے سے تم پگھل نہیں جاؤ گے۔‘‘ اس نے لہجے میں استہزاء کی بجائے مزاح کا تاثر برقرار رکھا تھا۔

’’سوری مجھے پگھلنے کا ڈر نہیں ہے لیکن ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا۔‘‘ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ ’’کیوں؟ کیا تمہارے معاشرے میں رومیو اور جولیٹ نہیں ہوتے یا سرے سے عورتیں ہی نہیں ہوتیں‘ میں نے کسی نیوز پیپر میں پڑھا تھا‘ مسلمان عورتوں کو گھروں میں قید رکھتے ہیں۔‘‘ اس کی طرح اکثر امریکیوں کا اسلام کے بارے میں یہی تصور تھا۔ ’’ایسا نہیں ہے! ہمارے ہاں بھی عورتیں گھروں سے نکلتی ہیں‘ مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں‘ دفاتر میں کام کرتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اس سے محبت کرنے لگتی ہیں۔‘‘ میں نے اسے اپنے معاشرے میں بتایا تو وہ بولی: ’’اس میں کیا چیز مختلف ہے؟ ساری دنیا کی عورتیں عام طور پر کسی ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہیں اور پھر اس کے ساتھ شادی کر لیتی ہیں۔‘‘ اس کے لہجے میں مذاق کا تاثر برقرار تھا۔ ’’میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں کی عورتیں مردوں کے ساتھ دوستیاں نہیں رکھتی ہیں۔ اور نہ ہی اپنے کسی نئے واقف کار کے بازو پر بے تکلفی سے

چٹکی کاٹتی ہیں۔'' میری بات سن کر اس کے ماتھے پر ایک ناگواری کی لکیر لمحے بھر کے لیے نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔ ''لیکن میں تمہارے معاشرے کی عورت نہیں ہوں اگر مجھے چٹکی کاٹنے سے تمہیں تکلیف ہوئی ہو تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ یہ بات کہی تو مجھے لگا کہ شاید میری بات اسے ناگوار گزری ہو۔ ''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم ہمارے معاشرے کی عورتوں کی طرح ہو جاؤ' میں تو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ آج تک کسی بھی لڑکی نے میرے ساتھ اس طرح کی بے تکلفی اختیار نہیں کیا۔'' میری بات پر وہ مسکرائی۔ ''تو پھر تم اتنے بڑے کیسے ہوگئے؟'' اس کے لہجے میں پھر شوخی آ چکی تھی۔ ''ہمارے ہاں لوگ اس طرح کی بے تکلفی کے بغیر ہی بڑے ہو جایا کرتے ہیں۔'' اس نے مصنوعی حیرت کے ساتھ آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا۔ ''اے تم کیا ویٹی کن سے اُٹھ کر آئے ہو؟'' اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میری توجہ اس خیال کی طرف مبذول ہوگئی' اس نے آہستہ سے ٹیبل بجایا اور پوچھا: ''تم کس کے ساتھ آن لائن ہو گئے ہو؟'' میں نے اسے بتایا کہ اس کا جملہ سن کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میری توجہ اسی خیال کی طرف مبذول ہوگئی۔ ''تمہاری بات سن کر یہ لگا کہ تم ویٹی کن میں بیٹھے ہوئے پوپ اور دوسرے مذہبی افراد کو پاک دامن اور مقدس سمجھتے ہو اور دنیا کے اکثر لوگوں کی ان کے بارے میں یہی رائے ہے اور ان کی اسی خوبی کی وجہ سے ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اسلام اپنے ہر ایک ماننے والے کو پوپ کی طرح پاک دامن دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ معاشرے کی نظر میں قابلِ احترام ہو۔'' میں نے اپنا خیال اسے بتایا تو وہ بولی: ''اس میں اسلام کی ایسی کیا خصوصیت ہے؟ عیسائیت کی تعلیمات بھی یہی ہیں کہ اسکے پیروکار پاک دامن ہوں' ان کے کردار پر کوئی داغ کوئی دھبہ نہ ہو بلکہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ دنیا کے ہر مذہب کی تعلیمات یہی ہوں گی۔'' اس بات پر مجھے یہ خیال آیا کہ دنیا کے بیشتر مذاہب کی بنیادی اخلاقی اقدار ایک جیسی ہوتی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا: ''اگر دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیمات یہی ہیں تو لوگ ان تعلیمات پر عمل کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا: ''جب اسلام کی تعلیم یہی ہے تو مسلمان اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ جو تمہارا جواب ہوگا وہی دیگر مذاہب کے ماننے والوں پر بھی صادق آ جائے گا۔'' دیکھنے میں تو اس نے مجھ سے سوال کیا تھا لیکن درحقیقت یہ میرے سوال کا جواب تھا' یعنی انسانوں میں اجتماعی طور پر کچھ نفسیاتی خامیاں پائی جاتی ہیں' جن کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ مذہب کی تعلیمات کو عارضی طور پر پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ جولیا واقعی ایک ذہین لڑکی ہے' میں اس کے ساتھ ابھی مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ ابھی میں نے کلاس لینی ہے۔ جہاں آج ڈاکٹر جارج کلونے نے اسلامی اصولِ قانون کی تاریخ پر لیکچر دینا تھا۔ امریکی یونیورسٹیوں کے لاء سکولز میں اسلامی اصولِ قانون اور اسلامی قانون کو ایک اہم مضمون سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ براعظم ایشیاء اور افریقہ میں موجود بیشتر اسلامی ممالک کے قوانین اسلامی فلسفۂ قانون سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ میں نے مختصر طور پر جولیا کو اس موضوع کی اہمیت کے بارے میں بتایا تو وہ بولی: ''تمہاری باتوں

سے یہ لگتا ہے کہ یہ کوئی بہت ٹیکنیکل قسم کا لیکچر نہیں ہوگا' میں چونکہ فارغ ہوں' اس لیے میں بھی اسے اٹینڈ کر لیتی ہوں۔'' ہم دونوں کینٹین سے اُٹھے اور سکول آف لاء کے مین آڈیٹوریم میں آ گئے' عالمی حالات' جہادی سرگرمیوں' عراق اور افغانستان میں امریکی افواج کی موجودگی اور سب سے بڑھ کر نائن الیون کے سانحے میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کے الزام کی وجہ سے بہت سے امریکی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ اس لیے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس لیکچر کا اہتمام مین آڈیٹوریم میں کیا گیا تھا۔ اور وقت کو مقرر کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا کہ سکول آف لاء میں مختلف کورسز کرنے والے افراد زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہو سکیں۔ ابھی لیکچر شروع ہونے میں دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ لیکن مین آڈیٹوریم کے باہر اسٹوڈنٹس کافی تعداد میں اکٹھے ہو چکے تھے' ان میں مجھے کچھ ایسے چہرے بھی نظر آئے جو مسلمان تھے اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے موضوع سے دلچسپی کے ساتھ سامعین کی کثرت کی ایک بڑی وجہ ڈاکٹر جارج کلونے تھے۔ امریکہ اور یورپ کے تمام اداروں میں انہیں مستشرقین کا استاد مانا جاتا ہے۔ وہ ہالینڈ کی لائیڈن یونیورسٹی کا شعبہ مشرقی علوم ہو یا انگلینڈ میں لندن یونیورسٹی کا سکول آف اورینٹل اینڈ افریقین سٹڈیز ہو' امریکن یونیورسٹی آف قاہرہ ہو یا ہارورڈ اور کولمبیا جیسی عظیم یونیورسٹیاں ہوں' ہر ادارہ انہیں اپنے ہاں مدعو کرنا اور ان سے استفادہ کرنا پسند کرتا ہے۔ آج وہ ہماری یونیورسٹی میں مدعو تھے۔ میں نے سوچا کہ ہمیں پہلے ہی ہال کے اندر جا کے بیٹھ جانا چاہیے تاکہ اپنی پسند کی نشست حاصل کر سکیں۔ میں نے اس خیال کا اظہار جولیا کے سامنے کیا تو اس نے میری بات کی تائید کی۔ ہم ہال میں داخل ہوئے تو ہم سے پہلے ہی کئی افراد ہال کے اندر بھی موجود تھے۔ ہم نے دو نشستیں سنبھال لیں۔ تقریباً دس منٹ گزرنے کے بعد باہر موجود بھی افراد اندر آ گئے۔ میں نے گردن موڑ کے دیکھا تو پورا آڈیٹوریم ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ میرے دل میں ملال سا پیدا ہوا کیونکہ مجھے یہ خیال آیا کہ مسلمانوں کی کتنی ہی تنظیمیں ہیں۔ ہر تنظیم کا اپنا قائد ہے جو اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خدمت صرف اس سے لے گا۔ لیکن ایسے کسی بھی مذہبی قائد یا تنظیم کو کبھی یہ توفیق حاصل نہیں ہوئی کہ وہ اپنے کسی کارکن کی اس نہج پر تعلیم و تربیت کریں کہ آگے چل کر وہ شخص بین الاقوامی سطح پر اسلامی علوم کا محقق بن جائے۔ اور اس قابل تو ہو کہ مستشرقین اس سے استفادہ کریں۔ یونیورسٹیاں اور دیگر ادارے اسلام آشنائی کے لیے اسے اپنے ہاں مدعو کریں۔ ''اب واپس آ جاؤ'' جولیا کی آواز کی دستک پر میں اپنے خیالات سے چونکا۔ چند منٹ بعد سکول آف لاء کے پرنسپل معزز مہمان کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے تو پورا ہال ان کے احترام میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور تالیاں بجا کر استقبال کیا۔ پرنسپل نے خود استقبالیہ کلمات کہے۔ ڈاکٹر جارج کلونے کا تفصیلی تعارف کروایا۔ اسلامی قانون کی اہمیت پر مختصر روشنی ڈالی اور پھر معزز مہمان کو مائیک کے سامنے آنے کی دعوت دی۔

''میرے پیارے سامعین! عددی اعتبار سے اسلام دنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہے۔ سب سے پہلے میں آپ لوگوں کے سامنے یہ

بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام اور مسلمان دو علیحدہ حقیقتیں ہیں، دونوں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے پس منظر ایک دوسرے سے الگ ہیں، کیونکہ یہاں زیادہ تر قانون کے طلباء بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم صرف اسلام کے قانون اور فلسفۂ قانون کے بارے میں بات کریں گے۔ مسلمانوں نے کس دور میں اسلام کے کون سے قانون کو کس طرح سے استعمال کیا، یہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں ہے۔ اس موضوع پر علمِ تاریخ یا بین الاقوامی تعلقات کا کوئی ماہر زیادہ بہتر انداز میں روشنی ڈال سکتا ہے۔ اسلامی قانون کا مطالعہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس قانون نے فلسفہ مذہب کی گود سے جنم لیا ہے۔ اور مذہب کی اپنی مخصوص اخلاقیات ہوتی ہیں، جن میں خدا یا معبود کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا مرتبہ مذہب کے بانی کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اور تیسری اہم حیثیت مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہوتی ہے، جو ہماری آپ کی طرح کے معاشرے کے عام افراد ہوتے ہیں، کیونکہ اسلام بھی ایک مذہب ہے، اس لیے اسلام کا قانون بھی خدا، بانیٔ مذہب یعنی حضرت محمدؐ اور مذہب پیشواؤں یعنی علماء کے گرد گھومتا ہے۔ قانون کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ وہ اپنے حکم کی خلاف ورزی برداشت نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے یہ خصوصیت اسلام میں بھی پائی جاتی ہے۔" ڈاکٹر جارج کلونے نے تمہید بہت عمدہ قائم کی تھی، اس کے بارے میں جو تعریفی کلمات سن رکھے تھے وہ ان سے کہیں آگے کی چیز محسوس ہو رہا تھا۔ پورا ہال گوش بر آواز تھا۔

"اسلامی قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی ریاست کا کوئی بھی فرد خدا کے حکم، جسے مسلمان قرآن کہتے ہیں اور پیغمبر اسلام کے حکم جسے مسلمان سنت کہتے ہیں، کوئی فرد یا کوئی ادارہ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک تیسرے طبقے کا تعلق ہے یعنی مسلمانوں کے مذہبی پیشوا، تو اس حوالے سے اسلام کی تاریخ بہت طویل اور بڑی اُلجھی ہوئی ہے۔ اس حوالے سے مختلف حضرات کو نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسلامی قانون کے ان بڑے ماہرین میں سے اکثریت کا تعلق غیر عرب علاقوں سے ہے۔ خدا اور پیغمبر کے احکام بنیادی اصولوں پر مشتمل ہیں۔ جبکہ بعد میں آنے والے مذہبی علماء نے ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں ذیلی مسائل کے احکام بیان کیے ہیں۔ اسلام کا فلسفۂ قانون سب سے پہلے دو چیزوں پر بحث کرتا ہے: قرآن اور سنت میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معنی اور ان کی مراد کا تعین کرنا اور دوسرا اہم موضوع یہ ہے کہ جن احکام اور معاملات میں کتاب وسنت میں کوئی واضح حکم نہیں ہے، ان کے بارے میں کتاب وسنت کی روشنی میں صحیح حکم بیان کرنا۔ اسلام کیونکہ ایک مذہب ہے، اس لیے اسلامی قانون کے بارے میں مسلمان اہلِ علم کا رویہ مذہبی روایت کی پاسداری کا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلامی سلطنت کی حدود پھیلنا شروع ہوئیں تو غیر عرب علاقوں کی تہذیب وتمدن میں روایت پسند عرب معاشرے سے زیادہ تنوع پایا جاتا تھا، اس لیے ابتدائی دور کے مسلمان قانونی ماہرین کے طرزِ عمل میں بھی ہمیں واضح فرق نظر آتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت جلد مذہب کی مخصوص روایت پسند جامد سوچ نے مسلمان قانون دانوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور انہوں نے اپنے پیش رو قانونی ماہرین کی قانونی آراء کو

مذہبی روایت کا درجہ دے دیا۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے زمانے میں آنے والے اسلامی فلسفۂ قانون کے ماہرین نے زیادہ تر ایسے اصول ایجاد کیے جن کا تعلق فلسفۂ قانون سے کم اور مذہبی روایت پسندی سے زیادہ تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس روایت پسندی کو ہی فلسفۂ قانون سمجھا جانے لگا۔ میں اس نکتے کو اس لیے زیادہ واضح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہی وہ پہلو ہے جو مسلمانوں کے مذہبی اختلافات یعنی اسلام میں فرقہ بندی کے وجود میں آنے کا سبب بنا۔'' میں بھی ایک مسلمان ہوں' میں نے زندگی میں کئی مرتبہ نمازِ جمعہ و نمازِ عید مذہبی اجتماعات' محفلِ ختم و درود وغیرہ میں اور اب امریکہ آ جانے کے بعد مختلف مذہبی چینلز' مختلف ویب سائٹس پر کئی علماء کے بیانات سنے ہیں لیکن مجھے دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ایسا بھرپور تجزیہ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں سنا۔ مجھے پھر وہی خیال آیا کہ کاش کوئی مسلمان سکالر بھی اس اندازِ فکر کا مالک ہوتا۔ انگریزوں کی یہی خوبی ہے کہ انہوں نے ہر چیز کو ایک علم' ایک مضمون کی شکل دے دی ہے۔ اور وہ کسی بھی علم اور فن کے بارے میں جامد سوچ کے مالک نہیں ہیں' بلکہ وہ ہر بات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اُمور کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں' مثبت اور منفی پہلوؤں کا تعین کرتے ہیں۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور جارج کلونے کا لیکچر جاری تھا' وہ کہہ رہا تھا: ''اسلامی فلسفہ قانون کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایک چیز وہ ہے جسے مسلمان اپنا فلسفہ قانون کہتے ہیں اور ایک چیز وہ ہے جسے فلسفہ قانون کہا تو نہیں جاتا لیکن آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد جب ہم اس معاشرے پر وہاں کی روایات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس غیر تحریر شدہ' غیر روایت شدہ فلسفہ قانون کے آثار و شواہد نظر آتے ہیں۔'' اس کے بعد جارج کلونے نے اپنے موضوع کو قانون کی روایتی زبان میں مختلف اجزاء میں تقسیم کیا اور ہر ایک ذیلی صورت کے بارے میں مثال بیان کرتا گیا' اس کے لیکچر کا عمومی تاثر ملا جلا تھا' اس کے انداز سے یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ کسی روایتی متعصب مستشرق کی طرح اسلام کی تعلیمات کی حیثیت کم کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسری طرف اس نے اسلامی فلسفہ قانون کے کچھ ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی جو روایتی مغربی فلسفہ قانون کی روشنی میں منفی حیثیت رکھتے ہیں' اس میں اہل مغرب کا فلسفہ قانون غلط ہے یا جارج کلونے کو اسلامی فلسفہ قانون کے ان پہلوؤں کا صحیح ادراک نہیں ہو سکا۔ میں اس کا صحیح ادراک نہیں کر سکا' ایک مرتبہ پھر مجھے یہی خیال آیا کہ کوئی مسلمان دانشور ایسا نہیں ہے کہ وہ اس نوعیت کے ابہامات کو ختم کر سکے' اس طرح کے اعتراضات کے جواب دے سکے' جارج کلونے کا لیکچر تقریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہا' اس کا لیکچر ختم ہوا تو سوالات کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ مختلف لوگوں نے اس سے مختلف سوالات کیے' میرے ساتھ بیٹھی ہوئی جولیا کھڑی ہوئی اور اس کے سوال پر پورے ہال میں سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں کے لیے جارج کلونے بھی خاموش رہا۔ جولیا کا سوال یہ تھا: ''جس چیز کو اسلامی قانون کہا جاتا ہے وہ دنیا میں کہیں عملی طور پر موجود بھی ہے؟ یا اس کا ذکر صرف کتابوں میں ہے؟''

جولیا کا اُٹھایا ہوا یہ سوال بظاہر بہت سادہ لیکن درحقیقت انتہائی پیچیدہ تھا کیونکہ قانون کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اسے نافذ کیا جائے۔ اور اگر کسی قانون کو عملی نفاذ کی بجائے صرف کتابوں کے اوراق تک محدود کر دیا جائے' تو وہ درحقیقت قانون نہیں ہوتا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ جارج کلونے کی خاموشی کا سبب اس کی لاعلمی نہیں ہے بلکہ مخصوص بین الاقوامی حالات ہیں' جس کی وجہ سے امریکہ میں عام مسلمان اور عام امریکی ایک دوسرے سے دور ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت حال میں کوئی بھی متنازع بیان ناگوار صورت حال پیدا کر سکتا تھا۔ امریکیوں میں ہزار خامیوں کے باوجود سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے سیاسی رہنما یا سرکاری اداروں کے ترجمان جو مرضی بیان دیں' اس کا ردِعمل اتنا شدید نہیں ہوتا لیکن یونیورسٹی کا استاد کوئی بھی رائے دیتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیتا ہے کیونکہ امریکی معاشرے میں یونیورسٹی کے استاد کی رائے کو بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جولیا سوال کر کے بیٹھ گئی اور چند لمحوں کے بعد جارج کلونے نے جواب کا آغاز کیا: ''میں یہ بات پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون نے مذہب کی گود سے جنم لیا ہے' اور مذہبی قوانین معاشرتی اخلاقیات اور رسوم و رواج کا تعین کرتے ہیں' عدالت یا پولیس

کے ذریعے جو قانون نافذ کیا جاتا ہے وہ درحقیقت قانون کا ایک حصہ ہے‘ ایک مخصوص شعبہ ہے‘ اس لیے ہم یہ اعتراف کر سکتے ہیں کہ معاشرتی رسوم و رواج کے حوالے سے اسلامی قانون نا صرف اسلامی ریاستوں میں بلکہ ان مسلمان معاشروں میں بھی موجود ہے جو اقلیت کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں‘ البتہ ریاست اور عدالت کی سطح کا اسلامی قانون اس وقت تقریباً مکمل طور پر صرف کتابوں تک محدود ہو گیا ہے۔‘‘ ڈاکٹر کلونے نے بڑی مہارت کے ساتھ صورتِ حال کو اپنے قابو میں رکھا تھا‘ اس نے مسلمانوں کی خامی بھی واضح کر دی اور ان کے جذبات کو بھی کوئی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ اس کے جواب دینے کا یہ انداز مجھے پسند آیا کہ اس نے مثبت پہلو کو پہلے پیش کیا اور منفی پہلو کا تذکرہ بعد میں کیا‘ اس کے بعد چند اور سوالات کیے گئے جن کے جواب ڈاکٹر کلونے نے دیئے‘ آخر میں اس نے اپنی بات سمیٹتے ہوئے یہ بات کہی: ’’قانون کا بنیادی مقصد انسانیت کی بہتری اور بھلائی ہے‘ قانون کوئی بھی ہو اس کی بنیادی روح یہی ہے کہ اس کی پاسداری کی جائے۔‘‘ بھرپور تالیوں کی گونج میں ڈاکٹر جارج کلونے ڈائس سے ہٹ کے اپنی کرسی پہ آ کے بیٹھا‘ سکول آف لاء کے پرنسپل نے ایک مرتبہ پھر مائیک کے سامنے آ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد میں اور جولیا واپس کنٹین میں آ کر بیٹھ گئے‘ سینڈوچ کے ساتھ کوک پیتے ہوئے ہم نے لیکچر کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال جاری رکھا۔ اچانک جولیا نے مجھ سے دریافت کیا: ’’تم عذرا کو فون کب کرو گے؟‘‘ اس کا یہ سوال میری توقع کے برخلاف تھا‘ اس لیے مجھے جواب دینے میں تامل ہوا‘ وہ شاید میری ذہنی کیفیت بھانپ گئی تھی‘ اس لیے پوچھنے لگی: ’’تم اسے فون کرنے میں مشکل محسوس کر رہے ہو؟‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی: ’’میرا مشورہ مانو تو میری یا اپنے کسی اور دوست کی موجودگی میں اسے فون کرنا۔‘‘ مجھے اس کی بات کا مقصد سمجھنے میں دیر نہیں لگی‘ وہ یہ چاہتی تھی کہ اگر میں دوبارہ کسی جذباتی کیفیت سے دوچار ہو جاؤں تو مجھے سنبھالنے کے لیے کوئی نہ کوئی ہمدرد میرے پاس موجود ہونا چاہیے۔ اس کا یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کے مشورے کی افادیت پر غور کیا اور اسی وقت فون کرنے کا فیصلہ کیا‘ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جاتا۔ میری سوچ کا عکس شاید میری آنکھوں میں نمودار ہوا تھا۔ جسے دیکھ کے جولیا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا انداز حوصلہ دینے کا سا تھا۔ اس کا نازک ہاتھ اس وقت میرے لیے کسی ستون کی طرح کا سہارا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور کسی پرسکون گوشے کی تلاش میں اطراف میں نظر دوڑائی۔ کنٹین کے ایک کونے میں چند میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ میں جولیا کا ہاتھ تھامے ہوئے ہی وہاں سے اٹھا اور کونے میں موجود آخری میز تک آ گیا۔ بیٹھنے کے بعد میں نے چند لمحے خود کو استوار کرنے میں گزار دیئے۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن‘ دورانِ خون اور سانس کی آمد و رفت تیز محسوس ہو رہی تھی‘ شاید میری پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی نمودار ہو چکے تھے‘ میرا ایک ہاتھ بدستور جولیا کے ہاتھ میں تھا‘ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے تشکر آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ

مجھے اپنا کام کر لینا چاہیے' میں نے دوسرے ہاتھ سے موبائل فون نکالا۔ رابطوں کی فہرست میں سب سے اوپر عذرا کا نام اور اس کا رابطہ نمبر موجود تھا۔ کال ملانے کے بعد میں نے لرزتے ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل فون کان کے ساتھ لگایا' تیسری بیل کے بعد فون اُٹھا لیا گیا۔ اور ''ہیلو'' کی آواز آئی' یہ اسی کی آواز تھی۔ اس کی آواز سن کر میں اپنے آپ اور اپنے آس پاس سے یکسر غافل ہو گیا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس نے دو تین مرتبہ ''ہیلو'' کہا تو بمشکل میرے منہ سے نکلا ''کیسی ہو؟'' اُس نے جواب دیا: ''میں ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟'' مجھے اس کی آواز میں نمی کا احساس ہوا۔ ''میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں'' واقعی میری حالت بھی یہی تھی۔ ''تمہاری آواز بھی کانپ رہی ہے۔'' پوری دنیا میں بس وہی ایک تھی جو میری ہر کیفیت کو فوراً سمجھ جایا کرتی تھی۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے اس سے اس کی' اس کے شوہر' بچوں' ماں باپ' بہن بھائیوں کی خیریت دریافت کی۔ جواب میں اس نے بھی مجھ سے سب گھر والوں' پاکستان میں موجود میرے قریبی دوستوں میں سے ہر ایک کے بارے میں دریافت کیا۔

''اتنے برس بعد تمہیں میری یاد کیسے آ گئی؟'' میرے لہجے میں شکوہ تھا' درمیان میں کتنا ہی وقت گزر چکا تھا' لیکن اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں گزشتہ شام کو اس سے ملا تھا' اور آج فون پر اس سے گلہ کر رہا تھا' انسانی نفسیات کا یہ پہلو بھی بہت عجیب ہے جب کسی شخص کو حسب منشاء کوئی چیز مل جاتی ہے تو اسے کامیابی کی خوشی اور جوش میں گزرے ہوئے وقت کی شدت بھول جاتی ہے' میں نے کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا لیکن پھر شرمساری محسوس ہوئی' میں نے تو اس سے اس وقت بھی شکوہ نہیں کیا تھا جب وہ اپنے باپ کی عزت اور انا کی خاطر میری محبت اپنے پیروں تلے روندکے جا رہی تھی' میں نے اس وقت بھی اس سے درخواست نہیں کی تھی تو پھر یہ آج میرے لہجے کو کیا ہو گیا؟

''یاد اُسے کیا جاتا ہے جو بھول جائے'' لہجے اور انداز سے قطع نظر اس کے یہ الفاظ خالص فلمی قسم کے تھے' میری زبان پھر پھسل گئی ''تو پھر میں یہ پوچھ لیتا ہوں کہ اتنے برس بعد تم مجھے کیسے بھول گئیں؟'' یہ صاف طنز تھا لیکن وہ بھی بلا کی حاضر جواب تھی ''بھولتے بھی وہی ہیں جو یاد آتے ہیں'' میرے طنزیہ لہجے کے جواب میں اس کی آواز شوخ ہو چکی تھی' زندگی سے بھرپور آواز' وہ مجھ سے بیوفائی کر کے بھی خوش تھی اور میں غلط نہ ہونے کے باوجود بھی غم اور افسردگی کے خول سے باہر نہیں نکل سکا تھا ''تمہارا شوہر اور بچے ٹھیک ہیں'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا: ''ہاں!'' اسے میرے لہجے میں موجود ملال کا احساس ہو گیا تھا' اسی لیے اس کا جواب مختصر تھا' ہمارے درمیان کچھ دیر سکوت رہا پھر اسی نے دریافت کیا: ''میں نیویارک آ رہی ہوں' اگر تم مناسب سمجھو تو تم سے ملنے بھی آ جاؤں؟'' اس کے لہجے میں جھجک تھی' ''یہ پوچھنے کی بات ہے؟'' میں نے استفسار کیا ''مجھے یہ خیال آیا تھا کہ شاید تم مجھ سے ناراض ہو اور ملنا پسند نہ کرو'' اس نے وضاحت کی تو میں نے جذباتی لہجے میں کہا: ''میں اپنی زندگی سے تو ناراض ہو سکتا ہوں مگر تم سے نہیں'' تو وہ بولی: ''اس کا مطلب ہے میں تمہاری زندگی نہیں ہوں'' اس کا لہجہ ایک مرتبہ پھر شوخ ہو چکا تھا' اس کے اس جملے پر میں نے قہقہہ لگایا' چند مزید رسمی جملوں کے تبادلے' معمولی سی نوک جھونک

کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ وہ نیویارک پہنچ کر مجھے مطلع کر دے گی اور پھر ہم ملاقات کا پروگرام طے کرلیں گے' دعاؤں اور خیر سگالی کے کلمات کے ساتھ میں نے کال ختم کی' تو مجھے یاد آیا کہ جولیا بھی میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی' اس کی چمکتی ہوئی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں اور ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی' میرا ایک ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا'' شیشے میں جا کر اپنا چہرہ دیکھو کس طرح کھلا ہوا ہے'' وہ بولی تو مجھے شرمندگی محسوس ہوئی کیونکہ عذرا کے ساتھ گفتگو کے دوران میں اسے مکمل طور پر فراموش کر چکا تھا' میری محجوبیت شاید میرے چہرے کے تاثرات سے آشکار ہوئی تھی' جو اس نے تسلی دینے کے انداز میں میرے ہاتھ پر تھپکی دی' میں نے ممنونیت کے اظہار کے لیے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت سخت کی' میں نے عذرا کے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو اسے بتائی تو وہ بولی: ''ایک بات کہوں؟ تم بُرا تو نہیں مناؤ گے؟'' میں نے سر کے اشارے سے اسے اجازت دی' وہ بولی: ''انسانی نفسیات بہت عجیب ہوتی ہیں' مجھے یوں لگا کہ عورتوں کے ساتھ تمہارا رویہ کچھ عجیب ہے' میں یہ نہیں کہتی میرے ساتھ' بلکہ دوسری کسی بھی عورت کے ساتھ بھی تمہارے رویے اور سلوک میں ایک ان دیکھا سا حجاب ہے' تمہارا طرزِ عمل ویسا نہیں ہے جیسا دوسرے مردوں کا ہوتا ہے'' اس نے لمحے بھر کے لیے اپنی بات روکی' شاید یہ جاننے کے لیے میں کیا وضاحت کرتا ہوں' لیکن میں خاموش رہا' میرے پاس کہنے کے لیے کوئی بات کوئی وضاحت نہیں تھی تو اس نے اپنی بات جاری رکھی'' میں اپنی اس بے تکلفی کی معافی چاہتی ہوں لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید تم نے خود کو کسی خول میں بند کیا ہوا ہے' اپنے آس پاس کچھ دیواریں بنا رکھی ہیں' پردے حائل کیے ہوئے ہیں'' میں جولیا کو ذہین لڑکی سمجھتا تھا لیکن وہ اتنی زیادہ ذہین ہوگی اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔'' اگر تم مناسب سمجھو تو میں ان دیواروں کے پار دیکھنا چاہتی ہوں'' زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے میرے ماضی کے بند دروازے پر دستک دی تھی مجھے خود پر قابو نہیں رہا اور بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''ارے یہ کیا! تم مرد ہو کر رو رہے ہو'' اس نے پریشان آواز میں کہا' میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی' اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کر کے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی میری طرف متوجہ تو نہیں ہے' یہ شکر تھا کہ ہم کنٹین کے الگ تھلگ گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا' میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں'' اس کا بنیادی مقصد میری دل جوئی تھا' لیکن میرے ردِّعمل سے اُسے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ تذکرہ میرے لیے اذیت کا باعث ہوگا۔'' میں کیا کروں اپنا آپ میرے قابو میں نہیں رہتا'' میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو وہ بولی: ''جب کوئی شخص کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو تو اُس کی ایک تھراپی یہ بھی ہے کہ اُسے یہ کہا جائے کہ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے ذہن میں موجود ہر چیز بیان کر دے' اس سے انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے''۔ مجھے لگا کہ وہ شاید مجھے نفسیاتی مریض سمجھ رہی ہے لیکن نفسیاتی مریض تو میں تھا کیونکہ زندگی کے کچھ معاملات میں میرا ردِّعمل غیر فطری ہوتا تھا' میں کچھ دیر بیٹھا سوچ بچار کرتا رہا اور پھر مجھے یہی مناسب محسوس ہوا کہ مجھے اپنے ماضی' اپنی ذہنی پراگندگی کے بارے میں اُسے اعتماد میں لے لینا چاہیے' اس میں میرے لیے سبکی کی کوئی بات نہیں تھی' میری ذہنی کشمکش میرے چہرے سے عیاں تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ہم یہاں سے اُٹھ کر کہیں اور چلتے ہیں''۔ اُس نے شاید میری کیفیت بھانپ کر یہ مشورہ دیا تھا' میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چند لمحے بعد اپنی کرسی کھسکا کے خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا' اپنی گھڑی پر وقت دیکھ کر میں نے اُس سے کہا: ''میں اگلے تین گھنٹے کے لیے تمہارے رحم وکرم پر ہوں'' میری بات پر اُس کی آنکھیں چمکیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی' ہم اُس کی چھوٹی سی سپورٹس کار میں بیٹھ کر یونیورسٹی سے باہر آ گئے' میں آرام دہ حالت میں سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اگلی منزل کا تعین اُس نے کرنا تھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ وہ مجھے کسی ریسٹورنٹ میں لے کر جائے گی۔ لیکن اُس نے شہر کے نواح میں موجود ایک رہائشی آبادی میں داخل ہو کر ایک گھر کے سامنے گاڑی روکی اور بولی: ''یہ میرا گھر ہے'' مجھے کچھ حیرت ہوئی' گاڑی سے اتر کر اندر جاتے ہوئے میں نے اُسے بتایا کہ ہمارے ملک میں کوئی لڑکا اپنی کسی یونیورسٹی فیلو کے ساتھ اُس کے گھر نہیں جا سکتا۔ ''خواہ وہ اُس کے دوست ہی کیوں نہ ہوں؟'' اُس نے حیرانگی سے دریافت کیا ''خواہ وہ اُس کی محبوبہ ہی کیوں نہ ہو'' میرے اس جواب پر اُس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے داخلی دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ ''میں سمجھتی ہوں تمہاری یہ معاشرتی روایات تمہارے ذہنی انتشار کا ایک اہم سبب ہیں''۔ مجھے اُس کا یہ جملہ پسند نہیں آیا ''وہ کیسے؟'' میں نے دریافت کیا تو وہ بولی: ''اس پر ہم آرام سے بات کرتے ہیں''۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اوپری منزل پر موجود اپنے کمرے میں آئی۔ لائٹ جلانے کی بجائے اُس نے آگے بڑھ کر ایک طرف موجود پردہ ہٹایا تو کمرے میں روشنی پھیل گئی کیونکہ وہاں کھڑکی نما دیوار گیر شیشہ لگا ہوا تھا' مجھے بیٹھنے کا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی' میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو دل ہی دل میں امریکیوں کی معاشرتی ترقی کو داد دی' کیونکہ وہاں ٹیبل لیمپ سے لے کر پیپر ویٹ' کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کیمرے تک ہر چیز کسی کارٹون اور ٹیڈی بیئر کی شکل میں تھی' جو اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ یہ کمرہ کسی لڑکی کے استعمال میں ہے اور پھر مجھے خیال آیا کہ ہمارے دیس میں اوّل تو لڑکیوں کو الگ کمرہ ہی نصیب نہیں ہوتا اور اگر نصیب ہو جائے تو وہاں لڑکی کے زیر استعمال ہونے کی علامت کمرے میں موجود خواتین کے لیے مخصوص ڈائجسٹوں کے پرانے شمارے ہوتے ہیں' کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں سینڈوچ اور کافی رکھے ہوئے تھے' اُس نے ایک مگ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا: ''ہاں اب شروع ہو جاؤ!''۔ ''کیا شروع ہو جاؤں؟'' میں نے دریافت کیا تو وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی: ''محبت کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' میرا خیال تھا کہ وہ کوئی پیچیدہ سوال پوچھے گی ''یہ صرف فلموں' ڈراموں اور قصے کہانیوں میں پائی جاتی ہے''۔ میں نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا تو وہ پُرسوچ انداز میں کہنے لگی: ''اس کا مطلب ہے کہ تم محبت کے نام پر کسی سے دھوکا کھا چکے ہو'' مجھے ہنسی آ گئی' میں نے پوچھا: ''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟'' وہ مسکرائی ''یہ میں بعد میں بتاؤں گی' تکنیکی اعتبار سے تمہیں دوسری مرتبہ بھی محبت ہوئی ہوگی'' مجھے اس کی سوچ کی رسائی پر حیرت ہوئی ''تم کس بنیاد پر یہ پیش گوئی کر رہی ہو؟'' اُس نے کافی کا گھونٹ بھرا اور بولی: ''میں کوئی جادوگرنی یا ستارہ شناس نہیں ہوں' امریکی معاشرے میں بھی بہت سے افراد

نجومیوں اور عاملوں پر اعتقاد رکھتے ہیں' یہ بات میرے علم میں تھی۔ ''تمہارے علم میں شاید یہ بات نہیں ہے کہ میں سائیکالوجی میں بی اے آنرز کر رہی ہوں'' اُس نے وضاحت کی تو میں نے کہا'' لیکن ماہرینِ نفسیات ماضی کی نفسیاتی خامیوں کا سراغ لگاتے ہیں اور وہ بھی کئی مرتبہ سیشن کرنے کے بعد'' میری حیرت اب بھی برقرار تھی'' انسانی نفسیات کا ایک عمومی پہلو یہ ہے کہ ہر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت' زندگی میں ایک مرتبہ صنفِ مخالف کے لیے خاص جذبات محسوس کرتا ہے'' وہ بولی تو میں نے اس کی بات کاٹی'' لیکن میرے بارے میں ابھی تم نے کہا کہ تکنیکی اعتبار سے مجھے دوسری مرتبہ بھی محبت ہوئی ہوگی'' وہ میری بے صبری پر مسکرائی'' دھیرج رکھو میں اُس کی بھی وضاحت کرتی ہوں'' اُس کے بعد اُس نے انسانی نفسیات کے بارے میں بیس منٹ کا لیکچر دیا' جسے سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ شاید میں شعبۂ نفسیات میں کوئی کلاس اٹینڈ کر رہا ہوں' اُس کی تمام گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر انسان زندگی میں ایک مرتبہ سچی محبت ضرور کرتا ہے' زیادہ تر لوگوں کو اوائل عمری میں اس تجربے کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر اوقات نتائج انسان کی خواہش کے برعکس ہوتے ہیں' اُس وقت کچھ لوگ اپنا غم غلط کرنے کے لیے نشہ آور اشیاء کے استعمال اور اس جیسی دیگر منفی سرگرمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن عمومی نفسیات کے حوالے سے اُن کی اس محرومی کا توڑ صنفِ مخالف سے تعلق رکھنے والا کوئی دوسرا فرد ہوتا ہے' یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ دو مختلف انسانوں کی شخصیت اُن کا مزاج اُن کی خوبیاں اور خامیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں' اس لیے انسان کے ذہن پر دو افراد کی اثر اندازی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے جس کے نتیجے میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھے پہلے فرد سے زیادہ محبت تھی دوسرے سے کم ہے' اور اگر پہلے فرد میں خامیاں زیادہ ہوں تو آپ دوسرے فرد سے زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں' یعنی آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں جسے محبت کہا جاتا ہے وہ کسی سے متاثر ہونے کا ایک فطری جذبہ ہے'' ''یہ بہت عمدہ سائنٹیفک تجزیہ ہے'' میں نے تعریفی انداز میں کہا'' لیکن اگر کوئی شخص کسی ایک فرد کی خاطر اپنی پوری زندگی تیاگ دے تو اس کے بارے میں تم کیا کہو گی؟'' میرا یہ خیال تھا کہ وہ اس کے جواب میں اس نوعیت کی طوفانی محبت کو قصوں کہانیوں کا حصہ قرار دے گی جس کا انسان کی حقیقی زندگی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا' لیکن اُس کا جواب میری توقع کے خلاف تھا' وہ بولی: ''ہر انسان کی ذہنی ساخت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے کچھ لوگ پیدائشی طور پر ذہین ہوتے ہیں کچھ نہیں ہوتے' کچھ جذباتی ہوتے ہیں کچھ نہیں ہوتے' اس پیدائشی فطری ساخت کے ساتھ دوسری بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ زندگی کا رویہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے' جو اُس کے ذہنی ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتا ہے' اس ذہنی ارتقاء میں انسان کا معاشرہ' اس کے آس پاس کا ماحول' اُس کی نشوونما سب چیزیں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اگر کسی ایک فرد کے لیے یہ تمام پہلو ایک خاص انداز سے سامنے آئیں تو اپنے مزاج کی شدت یا حساسیت کی وجہ سے کوئی شخص انتہائی قدم اُٹھا لیتا ہے' محبت میں ناکامی تو بہت بڑا دھچکا ہے' لوگ امتحان میں ناکامی کی وجہ سے بھی' غربت اور افلاس کی وجہ سے بھی خودکشی کر لیتے ہیں' اس کی وجہ امتحان کی اہمیت یا غربت کی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ بنیادی وجہ اُن کے اپنے ذاتی مزاج کی شدت اور انتہا پسندی

ہوتی ہے۔'' مجھے اُس کا مفہوم سمجھنے میں دیر نہیں لگی ''تم نے محبت جیسے عظیم جذبے کو زیادہ سائنسی نہیں بنا دیا' یوں جیسے یہ کوئی کیلکولیٹڈ چیز ہے'' میں نے واقعی زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کا اس طرح سے نفسیاتی تجزیہ سنا تھا وہ بولی ''لیکن تم نے خود ہی اس عظیم جذبے کو قصوں کہانیوں کی بات قرار دیا تھا'' اُس کا مقصد مجھے شرمندہ یا لاجواب کرنا نہیں تھا ''ہم علم نفسیات کو ایک طرف رکھتے ہیں' میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر ماضی کے کسی ناخوشگوار تجربے کی وجہ سے تمہارے مزاج یا رویے میں کوئی منفی پہلو آیا ہے تو اُسے دور کیا جا سکے''، عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ امریکی معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات صرف چند روزہ ہوتے ہیں' اُنہیں اپنے شوہر' بیوی' ماں باپ' اولاد کی کوئی پروا نہیں ہوتی لیکن وہ ایک اجنبی لڑکی جس سے تعارف اور شناسائی کا آغاز چند دن پہلے ہوا تھا' وہ اپنی تمام سرگرمیوں کو چھوڑ کر اس وقت صرف میری ہمدردی کے لیے وہاں بیٹھی تھی' اُس کا طرزِ عمل اس بات کا غماز تھا کہ وہ مجھے کوئی ذہنی مریض سمجھ کر ایسا نہیں کر رہی تھی اور اُس کی اس ہمدردی کے جواب میں' میں اپنی انا کی صلیب پر لٹکا ہوا تھا' کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد میں نے آخر کار اُسے اپنے ماضی میں شریک کرنے کا فیصلہ کر لیا' میں نے اپنے جوگر اُتارے اور دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گیا' میرے اس بے تکلفانہ انداز کو دیکھ کر جولیا کی آنکھوں میں خوشی کا تاثر ابھرا ''میری شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لیے تمہیں یہ نکتہ سامنے رکھنا چاہیے کہ میری نشوونما جس ماحول میں ہوئی وہ اتنا سخت نہیں تھا کہ کسی کو صنفِ مخالف کی جھلک ہی نظر نہ آئے اور اتنا آزاد بھی نہیں تھا کہ اوائل عمری میں ہی' میں ''ہیومن فزیالوجی'' کی باریکیوں سے آگاہ ہو جاتا''۔ میرے اس جملے کے جواب میں اُس نے ایک امریکی محاورہ استعمال کیا جس کا مطلب یہ تھا' گویا تم آدھے تیتر اور آدھے بٹیر ہو' اُس کا یہ کہنا تھا کہ اس نوعیت کی صورتِ حال کا سامنا کرنے والے افراد نفسیاتی طور پر اُن لوگوں سے کم ڈسٹرب ہوتے ہیں جو مکمل پابندی یا مکمل آزادی میں سے کسی ایک انتہاء پر ہوتے ہیں۔ اُس کے بعد میں نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ میں عمر کے کس حصے میں کس سے متاثر ہوا' اور اگر میں اب بیٹھ کر تجزیہ کرنا چاہوں تو اس تاثر کی نوعیت' سبب اور نتیجہ کیا تھا' اُس نے پوری توجہ سے کسی دخل اندازی کے بغیر میری ساری بات کو سنا' عذرا کے ساتھ تعلق کے آغاز' باہمی اختلاف اور پھر علیحدگی میں اُس نے خاص دلچسپی لی کیونکہ عذرا کے ساتھ فون پر گفتگو کے دوران میری وارفتگی کو وہ خود دیکھ چکی تھی' جب میرا اقبالی بیان ختم ہوا تو اُس نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا: ''تمہاری اس ساری گفتگو سے میری بات کی تائید ہو گئی کہ جب انسان ایک محبت میں ناکام ہوتا ہے تو سہارے کے لیے دوسرے شخص کے پیچھے بھاگتا ہے' تم بھی پہلے ایک شخص سے متاثر ہوئے وہ نہیں ملا تو دوسرے کا سہارا لینے کی کوشش کی وہاں بھی ناکامی ہوئی تو تیسرے کے پیچھے بھاگے' تم یہ کہتے ہو کہ یہاں بھی مقدر نے یاوری نہیں کی' اُس کے بعد تمہیں ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس کے قرب کے حصول کے تم آرزومند ہو؟'' اُس کے سوال کے جواب میں مجھے اعتراف کرنے میں تامل ہوا لیکن میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا: ''ایک شخص ایسا ہے'' اُس نے بے چینی سے پوچھا: ''کون؟'' میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا: ''ڈورتھی'' اُس نے میرا لفظ کھینچ کر دہرایا اور بولی: ''وہ راہبہ''۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو

اُس نے ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے سیٹی بجائی' مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ مجھ پر لعن طعن کرے گی لیکن میں نے پھر بھی دریافت کیا: ''تمہیں یہ بات بُری لگی؟'' اُس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا'' ''مجھے کیوں بُری لگے گی'' میں نے وضاحت کی: ''کیونکہ وہ ایک راہبہ ہے'' تو اُس نے تیزی سے کہا: ''وہ ایک عورت بھی ہے اور مرد عورتوں میں ہی دلچسپی رکھتے ہیں'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا: ''تم ایک ڈرپوک آدمی ہو' ایک سہمے ہوئے پرندے' تم نے یقیناً اُسے یہ بات نہیں بتائی ہوگی'' میں نے بے بسی سے کہا: ''میں یہ بات اُسے کیسے کہہ سکتا ہوں'' وہ کچھ دیر تک سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر بولی: ''میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں اگر وہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو بھی تم نے اس کے سامنے یہ اعتراف کرنے میں بہت سا وقت ضائع کر دینا تھا'' اُس کا یہ تجزیہ بھی اپنی جگہ درست تھا' میں واقعی اس حوالے سے کچھ بزدل تھا: ''خیر میں دیکھتی ہوں کہ اس حوالے سے تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں'' اُس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا' اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی گفتگو میں مشغول ہو گئے' شاید اُس کے نزدیک میرا آج کا سیشن ختم ہو چکا تھا' چند گھنٹے اُس کے ساتھ گزارنے کے بعد میں ہاسٹل واپس آیا تو خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا' میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کوئی طربیہ گیت گنگناؤں' اوٹ پٹانگ حرکتیں کروں' اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے جوگر اُتار کر اپنے سامنے میز پر رکھے' اس سے تسلی نہیں ہوئی تو میں نے انہیں بال فرض کرتے ہوئے کمرے کے ایک کونے میں موجود باسکٹ میں پھینکنے کی کوشش کی' میرا پہلا نشانہ خطا گیا لیکن دوسرا جوگر باسکٹ کے اندر جا کے گرا تو مجھے بہت خوشی ہوئی' کچھ دیر اسی طرح کی فضول حرکتیں کرنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک اسائنمنٹ بھی تحریر کرنی ہے' اُس کے بعد میں رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہا' اگلے چند دن عام معمول کے مطابق گزرے دو ایک مرتبہ ڈورتھی گزرتی ہوئی نظر آئی لیکن جولیا سے ملاقات نہیں ہوئی' اس دوران ایک مرتبہ بلراج سنگھ مجھے اپنے ساتھ سونیا کے ہاسٹل لے کر گیا' سونیا کے کمرے میں پرانے گیتوں اور مشرقی موسیقی کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود تھا' اُس نے اپنے پسندیدہ گیت مجھے سنوائے' اُن میں سے ایک گیت کے بول اور دُھن مجھے بہت پسند آئے' بے چین نظر' بے تاب جگر' یہ دل ہے کسی کا دیوانہ' سونیا نے مجھے بتایا کہ یہ گیت ایک بڑے گلوکار طلعت محمود کا گایا ہوا ہے' مجھے کیونکہ موسیقی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں اس نام سے واقف نہ تھا لیکن آئندہ چند دن تک میں اپنے ہونٹ بند کر کے ناک کے ذریعے آواز نکال کر اس کی دھن گنگناتا رہا' ایک دن ایڈمنسٹریشن بلاک کی راہداری سے گزرتے ہوئے اچانک ڈورتھی سے سامنا ہو گیا' جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے کے تاثرات سپاٹ ہو گئے ہیں' رسمی اعتبار سے اُسے میرے پاس رُک کر حال احوال پوچھنا چاہیے تھا لیکن اُس نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے جانتی ہی نہیں' میں نے اُسے مخاطب کرنا چاہا لیکن کچھ سوچ کر رُک گیا' اس واقعے کے چند دن بعد جولیا مجھے ڈھونڈتی ہوئی میرے ڈیپارٹمنٹ میں آ گئی' میں اُس وقت نیروبی سے تعلق رکھنے والے اپنے کلاس فیلو سامبا کے ساتھ بیٹھا اگلی مشترکہ اسائنمنٹ کے بارے میں ڈسکشن کر رہا تھا' میں نے اپنا کام سمیٹنا چاہا تو اُس نے مجھے اشارہ کیا کہ تم ایسا نہ

کرو پھر اُس نے اپنی نوٹ بک کھول کے اُس پہ کچھ لکھا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی: ''یہ میرے گھر کا ایڈریس ہے تم نے آج شام ٹھیک چھ بجے یہاں پہنچ جانا ہے'' یہ کہہ کر وہ ہاتھ ہلا کر رخصت ہوگئی' وقت کی پابندی کیونکہ ہمارے قومی مزاج میں شامل نہیں ہے' اس لیے میں دس منٹ کی تاخیر سے اُس کے گھر پہنچا' ڈور بیل کے جواب میں چند لمحے بعد دروازہ کھلا تو مجھے لگا کہ شاید یہ میرے حواس کی کوئی آزمائش ہے۔

میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میرا اس سے سامنا ہوگا' میں نے باقاعدہ آنکھیں مل کر انہیں بار بار جھپک کے تسلی کی' وہ واقعی ڈورتھی ہی تھی۔ میری حیرت پر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی یوں جیسے وہ میری حالت سے لطف اندوز ہوئی ہو۔اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا' اندر آ کے میں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا' میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر اُس نے وضاحت کی: ''جولیا کچن میں مصروف ہے'' رسمی مزاج پُرسی کے دوران ہی جولیا بھی آ گئی' اُس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی' کھانے کے دوران ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی' کھانے کے بعد جب ہم کافی پینے بیٹھے تو جولیا نے بات شروع کی: ''میرا خیال ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو اپنا تعارف کرواؤ'' ڈورتھی نے اپنا تعارف کروایا: ''میرا نام ڈورتھی اولیانے ہے'' اُس کے بعد اُس نے بتایا کہ وہ پولینڈ کی رہنے والی ہے اور ایک چرچ میں راہبہ کے فرائض سرانجام دے رہی ہے' پھر اُس نے اپنے تعلیمی سلسلے کا ذکر کیا' ''میرا نام رضا ہے'' میں نے اپنا تعارف کروایا' اپنے تعلیمی پس منظر کے بارے میں بتایا' تعارف سے فارغ ہونے کے بعد جولیا مجھے مخاطب کر کے بولی: ''میں نے ڈورتھی کے سامنے اس بات کا ذکر کیا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو' تو ڈورتھی نے تم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا'' ہم جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں محبت کے موضوع پر اس بے تکلفی سے تبادلۂ خیال نہیں کیا جاتا اور ہمارے معاشرے میں یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ مذہبی حیثیت رکھنے والا کوئی بھی شخص صنف مخالف کے ساتھ کوئی وابستگی ظاہر نہیں کر سکتا' کیونکہ مذہبی اخلاقیات میں صنف مخالف کے ساتھ تعلق کی صرف ایک صورت شادی ہے' اس لیے میں یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ ڈورتھی نے خود مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہوگی' اس لیے میں نے وضاحت کی: ''امریکی معاشرے میں محبت کا مفہوم آبادی سے باہر کسی جھیل کے کنارے بنے ہوئے ہٹ میں کچھ وقت اکٹھے گزارنا ہے جبکہ ہمارے ہاں محبت کا مطلب کسی شخص کو پسند کر کے صرف دور سے اُسے دیکھ لینا ہے'' محبت کی اس تعبیر پر وہ دونوں مسکرائیں' اب کی بار ڈورتھی نے مجھے مخاطب کیا: ''میں نے تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار اس لیے کیا کیونکہ ہماری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جب تم نے اپنے بعض دوستوں کو اسلام کے بارے میں غور وفکر کی دعوت دی تھی تو میں نے سوچا کہ میں تمہیں بھی اپنے مذہب یعنی عیسائیت کی دعوت دوں'' اُس نے صراحت کی کہ اُس کے منصب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دے' میں نے اُس سے دریافت کیا: ''مجھے کس بنیاد پر عیسائیت کا مطالعہ کرنا چاہیے؟'' کیونکہ میں خود بھی اُن لوگوں کو اسلام کے بارے میں دعوت دے چکا تھا' اس لیے اب اخلاقی طور پر مجھے اس کی دعوت بھی سننا تھی' وہ بولی: ''عیسائیت اِس زمانے میں ترقی یافتہ اقوام کا مذہب ہے'' میں نے اُس کی بات سے اختلاف کیا: ''لیکن ان اقوام کی ترقی' عیسائیت کی مرہونِ منت نہیں ہے'' پھر میں نے وضاحت کی کہ میں اسلام اور عیسائیت سمیت دنیا کے تمام مذاہب کا احترام کرتا ہوں اور اس احترام کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس بات کی مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ

اپنی پسند کے مطابق عقیدہ اختیار کرے' البتہ اس نظریاتی اختلاف میں ہمیں یہ پہلو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے کہ گفتگو کے ذریعے نظریات کا تقابل کر کے بہتر نتیجے تک پہنچنے کی گنجائش باقی رہے' میں نے یہ نقطہ بھی اُٹھایا کہ عقیدہ ایک سوچ ہوتی ہے' ایک تہذیب ہوتی ہے' سوچ اور تہذیب کے اس اختلاف کے بارے میں جب بحث کی جاتی ہے تو اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ یہ عقیدہ منطقی اعتبار سے حقیقت کے کتنا قریب ہوسکتا ہے؟ یہاں یہ بحث نہیں کی جاسکتی کہ یہ عقیدہ فلاں علاقے سے تعلق رکھتا ہے تو ہم اسے قبول کر لیتے ہیں یا مسترد کر دیتے ہیں' مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ اُن کے نظریات کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے ہمیشہ علاقائی اور سیاسی حوالے سے اُن نظریات کی مخالفت کی جاتی ہے۔ میری اس وضاحت پر جولیا نے دریافت کیا: ''لیکن عیسائیت میں کوئی ایسی خوبی ہوگی کہ یہ دنیا کا اکثریتی مذہب ہے اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے اکثر شہری اس عقیدے کے قائل ہیں'' میں نے اُسے سمجھایا کہ معاشرتی اور اجتماعی ترقی کبھی کسی ایک مخصوص خطے میں ہمیشہ موجود نہیں رہی' تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل و دانش کی جڑیں کبھی یونان میں ہوتی تھیں' جہاں ارسطو اور افلاطون جیسے عظیم فلسفی پیدا ہوئے' پھر ان کا مرکز مسلمانوں کے علاقے بنے' لیکن آج مغرب میں پڑھائی جانے والی تاریخ میں سے مسلمانوں کے اس ماضی کو نکال دیا گیا ہے اور اس عہد کو تاریک دور کا نام دیا گیا ہے' اس تاریک دور کے ختم ہونے پر ترقی کا سویرا طلوع ہوا' لیکن اس کا مرکز فرانس' جرمنی' انگلستان تھے' امریکہ میں یہ روشنی اُسی طرح بعد میں پہنچی جس طرح سورج کی روشنی امریکہ تک بعد میں پہنچتی ہے' یہ ایک اتفاق ہے کہ ہم جس عہد میں پیدا ہوئے' اُس میں امریکیوں کو معاشرتی ترقی کے ساتھ عالمی بالادستی بھی حاصل ہوگئی اور یہ عہد کیونکہ اطلاعات و نشریات کا عہد ہے' اس لیے امریکہ میں بیٹھ کر ہم لوگ تصویر کا صرف وہی رُخ دیکھتے ہیں جو یہاں کے نشریاتی ادارے ہمیں دکھاتے ہیں' ہمارے نزدیک افریقہ کے کسی دور دراز ملک میں بیٹھا ہوا کوئی شخص دانشور نہیں ہوسکتا' دانشور صرف وہی ہوگا جو کسی بڑی مغربی یونیورسٹی کا پروفیسر ہو' کسی بڑے ٹیلیویژن چینل پر ناقد اور تبصرہ نگار کے طور پر مدعو ہوتا ہو۔ ڈورتھی نے سوال اُٹھایا: ''اگر اسلام سچا مذہب ہے تو پھر مسلمان اس دنیا میں خوار و زبوں کیوں ہیں؟'' یہ ایک ایسا سوال ہے جو مختلف فورم پر اُٹھایا جاتا ہے' اس کی مختلف وجوہات پیش کی جاتی ہیں اور کوئی ایک جواب سامنے نہیں آتا' کچھ لوگوں کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کو پس پشت ڈال چکے ہیں' کچھ لوگوں کے نزدیک جہاد کے ذریعے مسلمانوں کو دوبارہ عروج حاصل ہوسکتا ہے' لیکن مجھے ذاتی طور پر ان وجوہ کو قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے' میں یہ سمجھتا ہوں کہ خدا ہر مذہب' ملک و ملت کا خدا ہے' اس نے دنیا میں انسان کو مختلف اعتبار سے آزادی دی ہے' رنگ' نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر وہ اپنے ازلی فیصلوں کے تحت دنیا میں کبھی کسی ایک قوم کو عروج نصیب کرتا ہے اور دوسری اقوام کو زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے' کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا دنیا میں اپنے کسی منکر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا' یہ ساری بات میں نے اُن لوگوں کے سامنے بھی بیان کر دی' اسی نوعیت کے سوال جواب کے دوران شام ہوگئی' میں نے اُٹھنے سے پہلے یہ وضاحت کی کہ میں

ڈورتھی کو پسند کرتا ہوں' لیکن میرے اور ڈورتھی کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے' جس میں مذہب کے اختلاف کے ساتھ' ڈورتھی کا راہبہ ہونا ایک اہم وجہ ہے' کیونکہ اگر میں ڈورتھی کا ہم مذہب ہوتا تو بھی اُس کے ساتھ شادی کی آرزو نہیں کرسکتا تھا' لیکن جس چیز کو مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا اُسے مکمل طور پر چھوڑا بھی نہیں جاسکتا' اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے ہوسٹل آ گیا' اپنے اسائنمنٹ تیار کرنے کے بعد رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو خود کو ''میرا نام ہے جوکر'' کا ہیرو سمجھ رہا تھا' جسے جو بھی دشمن جاں ملا' وہی پختہ کارِ جفا ملا' ہر شخص کے ساتھ زندگی کا سلوک یہی ہوتا ہے کہ انسان کی بعض خواہشات پوری نہیں ہوتی ہیں' میرے ساتھ یہ عجیب اتفاق تھا کہ میرے دل نے ہمیشہ جس شخص کے حصول کی آرزو کی' وہی شخص مقدر میں نہیں تھا' کبھی اس بات پر خدا سے شکوہ بھی ہوتا ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے' سبھی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

اگلے دن دو لیکچر اٹینڈ کرنے کے بعد میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں لان میں بیٹھا ایک لاء جرنل کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی' میں نے مڑ کے دیکھا تو حسن البکر برآمدے میں کھڑا تھا' وہ تیونس کا رہنے والا تھا' ہم دونوں اکثر جمعہ کی نماز ایک ہی مسجد میں ادا کرتے تھے' روایتی مفہوم کے اعتبار سے وہ میرا دوست نہیں بلکہ صرف واقف کار تھا' اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار ظاہر تھے۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ پولیس نے اس مسجد کے امام کو گرفتار کرلیا ہے جہاں ہم نماز ادا کیا کرتے تھے' اور مسجد کو سیل کردیا گیا ہے' مجھے یہ سن کر بہت حیرانی ہوئی کیونکہ مسجد کا وہ امام ایک مہذب شائستہ' نرم خو' تعلیم یافتہ شخص تھا' وہ ہمیشہ اپنی تقاریر میں معاشرتی اخلاقیات اور احترامِ انسانیت کا درس دیتا تھا' حسن البکر نے مزید بتایا کہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے والے چند افراد نے مل کر اس حوالے سے احتجاج کا پروگرام بنایا ہے' ایک شخص نے اس احتجاج میں شریک ہونے کے لیے حسن البکر کو بھی دعوت دی تھی اور وہ اب اس بات پر پریشان تھا کہ ایسے کسی احتجاجی مظاہرے میں شرکت کی وجہ سے کہیں کوئی سرکاری ادارہ اس کے پیچھے نہ پڑ جائے' امریکہ میں رہنے والے اکثر مسلمان اس طرح کی صورتِ حال میں اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں' یہ بات میرے علم میں تھی کہ حسن البکر نے مجھ سے پوچھا: اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ میں اس امام مسجد سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھا' میں صرف اس کے اخلاق اور خطبات کو پسند کرتا تھا' مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ امریکہ کے بارے میں اس امام مسجد کی سوچ کیا ہے؟ وہ کسی جہادی تنظیم کا نمائندہ تو نہیں ہے؟ کون سے ادارے نے اسے گرفتار کیا ہے؟ اس پر کیا الزام عائد کیا گیا ہے؟ میں نے کہا: ''تم جس مسجد کا تذکرہ کررہے ہو وہ باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد بنائی گئی ہوگی' اس کے ٹرسٹیز کا کوئی بورڈ ہوگا' اس بورڈ کے ارکان کا ریکارڈ' بلکہ اس امام مسجد کا بھی پورا ریکارڈ پولیس یا دوسرے متعلقہ اداروں کے پاس ہوگا'' میں نے اُسے مشورہ دیا کہ ہمیں فی الحال اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے کیونکہ اگر وہ امام بے قصور ہوا تو پولیس اسے چند دن بعد خود ہی چھوڑ دے گی اور اگر وہ قصوروار رہا ہوا تو ہم کسی قصوروار شخص

کا ساتھ کیوں دیں؟ حسن البکر نے جھجکتے ہوئے کہا: ''دراصل جس شخص نے مجھے فون کر کے احتجاجی مظاہرے میں شریک ہونے کے لیے کہا ہے اس کا یہ کہنا ہے کہ اگر تم اس مظاہرے میں شریک نہیں ہوتے تو جان لینا! تمہارا ایمان کمزور ہے' تم چند روزہ دنیاوی فائدے کے لیے حق سے منہ چھپا رہے ہو' ایک دن تم نے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے' اس وقت تم کیا عذر پیش کرو گے'' اب مجھے سمجھ آئی کہ حسن البکر کی پریشانی کی اصل وجہ کیا ہے؟ میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا: ''تمہیں فون کرنے والا شخص یقیناً کوئی جوشیلا مسلمان ہوگا'' میری اس بات کے جواب میں حسن البکر نے بتایا: ''وہ شخص مصری ہے' اور اس کا شہر کے فلاں علاقے میں ایک بڑا سا سٹور ہے'' میں نے حسن البکر کو سمجھایا کہ ایمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ منہ اُٹھا کر احتجاج میں شریک ہونے چل پڑیں' وہ بھی ایک ایسی صورتِ حال میں جبکہ ہمیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ ملزم شخص بے گناہ ہے یا قصوروار ہے' میں نے اسے کہا کہ ابھی ہمیں صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے' جب معاملہ واضح ہوگا تو پھر ہم اس بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کر لیں گے' میں نے اسے یہ بھی مشورہ دیا کہ ہماری یونیورسٹی کے جو دیگر طلباء وہاں جاتے ہیں' انہیں بھی اس بات کی تلقین کرے' میں نے اسی طرح سمجھا بجھا کے حسن البکر کو رخصت کیا' دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا تھا' میں نے کنٹین میں آ کر کھانا کھایا اور پھر لائبریری میں آ گیا' رات گئے تک ریسرچ میں مصروف رہا' رات گئے اپنے کمرے میں آ کر جب میں سونے کے لیے لیٹا تو مجھے یاد آیا کہ ہمارا امام مسجد گرفتار ہو چکا ہے' لائبریری میں ریسرچ میں گم ہو کر میں یہ بات مکمل طور پر بھول چکا تھا۔

اگلے دن میں یونیورسٹی آیا' دو لیکچر لینے کے بعد میرا ارادہ تھا کہ لائبریری میں بیٹھ کر اسائنمنٹ تیار کروں گا' میں نے سوچا پہلے کنٹین جا کر کچھ کھا لوں تا کہ پھر شام تک یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہوں' میں کنٹین میں آیا تو وہاں مجھے حسن اکبر نظر آیا' جو چار دیگر افراد کے ساتھ تھا' وہ سب لوگ ایک ہی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے' اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا' اس لیے مجھے اس کے پاس آنا پڑا' میں نے وہاں بیٹھے دوسرے چار افراد کے ساتھ بھی مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا' حسن البکر نے پہلے میرا ان سے تعارف کروایا' پھر ان کا تعارف مجھ سے کروایا' ان میں سے ایک کا نام سلامہ حمر تھا وہ سرخ و سفید رنگ کا مالک ایک بھاری بھر کم شخص تھا' اور شام کا رہنے والا تھا' دوسرا اس کا بالکل اُلٹ تھا' گہرے رنگ کا مالک ایک دھان پان سا شخص' اس کا نام سفیان بن قیس تھا وہ یمن کا رہنے والا تھا' تیسرا شخص لکھنؤ سے تعلق رکھتا تھا' حسن البکر نے اس کا نام بتاتے ہوئے تلفظ غلط ادا کیا تو اس نے فوراً تصحیح کر کے بتایا کہ اس کا نام نواب صفدر یار جنگ ہے' میرا تعارف کرواتے ہوئے حسن البکر یہ بتا چکا تھا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے پہلے شاید اسی لیے اس نے یہ تصریح ضروری سمجھی کہ وہ ایک نواب ہے' چوتھا شخص اپنے نقوش سے مشرق بعید کا باشندہ لگ رہا تھا' اس نے اپنا نام محمد یوسف بتایا اور وضاحت کی کہ وہ چینی نژاد امریکی ہے' اتفاق ایسا تھا کہ ہم چھ افراد اسی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے اور ہم سب مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے' لیکن اس وقت صرف ایک مسئلے کی وجہ سے وہاں اکٹھے تھے اور مسئلہ امریکی معاشرے میں اپنی مذہبی شناخت کی بقاء کا تھا' مجھ سے پہلے وہ اسی مسئلہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟

میرے دریافت کرنے پر حسن البکر نے بتایا' ہمارے امام مسجد کو تفتیش کے لیے کسی خفیہ مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے' اور اس پر یہ الزام ہے کہ اس کے دہشت گردوں کے ساتھ روابط کے کچھ شواہد سرکاری ایجنسیوں کو ملے ہیں' اور جہاں دہشت گردی کا لفظ آ جائے' وہاں امریکی قانون اور معاشرہ دونوں چشم پوشی کی پالیسی اختیار کر لیتے ہیں' اس لیے سر دست اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ امام مسجد رہا ہو جاتا' لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ مسجد کو سیل کر دیا گیا تھا۔

اُس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ مسلمان معاشرے میں مسجد کی اہمیت کیا ہے؟ اپنے ملک میں رہتے ہوئے ہمارے نزدیک مسجد صرف ایک عمارت کی حیثیت رکھتی تھی' جس کے سامنے سے ہم روزانہ کئی مرتبہ گزر جایا کرتے تھے' لیکن اس وقت دیارِ غیر میں وہی چھوٹی سی عمارت ہمارے لیے ایک اہم ضرورت تھی' اُس کی چار دیواری' اُس کی زمین پر بچھے ہوئے قالین پر کیے جانے والے سجدے' ہماری شناخت' ہماری بقاء کے لیے ضروری تھے' یمن کے رہنے والے سفیان بن قیس کا یہ مشورہ تھا کہ اس بارے میں شہر کی مساجد کی یونین یا کونسل کو اقدامات کرنے چاہئیں اور ہمیں صرف اُن اقدامات کو سپورٹ کرنا چاہیے' سلامہ حمر شامی کا مشورہ یہ تھا کہ یونیورسٹی میں پڑھنے والے تمام طلبہ اکٹھے ہو کر احتجاجی مظاہرہ کریں کیونکہ عام طور پر احتجاجی مظاہروں کو میڈیا کی طرف سے کوریج حاصل ہوتی ہے' اس طریقے سے ہم زیادہ بہتر طور پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروا سکتے ہیں' جس وقت میں وہاں پہنچا اُس وقت تک سفیان اور سلامہ اپنا موقف پیش کر چکے تھے' اب صفدر یار جنگ نے مشورہ دینا تھا' وہ بولا: ''امریکہ ہمارا ملک نہیں ہے' یہ کوئی اسلامی ملک بھی نہیں ہے' اگر یہاں کے اداروں نے اپنے ملک کی سلامتی کے لیے ایک مشکوک شخص کو گرفتار کر لیا ہے تو ہمیں اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے'' اپنی گفتگو سے وہ مجھے کوئی کانگریسی ذہن کا مالک شخص نظر آیا' شناخت کے اعتبار سے ایک مسلمان ہونے کے طور پر اس طرح کے لوگوں کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اغیار کے پاس اُن کی اس آزاد خیالی کو سننے اور داد دینے کی فرصت نہیں ہوتی' اسی لیے یہ لوگ ہم جیسے سادہ لوح مسلمانوں کے پاس بیٹھ کر اپنے دانشوری کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں' میں نے اُس کی بات سے اختلاف کیا: ''امریکہ ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوری ملک میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے' ہم اگرچہ عارضی طور پر یہاں قیام پذیر ہیں' لیکن یہ ہمارا حق ہے کہ جب ہم کسی منفی سرگرمی میں شریک نہیں ہیں تو ہمیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض سرانجام دینے کی اجازت ہونی چاہیے'' میری بات پر اُس نے ماتھے پر بل ڈالے ''لیکن اگر آپ اس آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے دہشت گردوں کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہیں تو پھر آپ کے جمہوری حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں'' میں نے دریافت کیا: ''ہم نے کون سے دہشت گردوں کے ساتھ روابط قائم کیے ہیں؟'' اُس نے فوراً کہا: ''جس امام کو گرفتار کیا گیا ہے اُس کے دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات تھے'' میں نے اُس کی تصحیح کی: ''اُس امام کے تعلقات نہیں تھے بلکہ اُس پر یہ الزام ہے' تعلقات ہونے کی بات آپ اُس وقت کر سکتے ہیں جب آزاد تحقیقات' دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ امام منفی

سرگرمیوں میں ملوث ہے اور اگر امریکی اداروں کے پاس ایسے شواہد موجود ہوتے تو وہ اُن شواہد کو عدالت میں پیش کر دیتے' اُنہیں ملزم کو نامعلوم خفیہ مقام پر منتقل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی''۔ محمد یوسف جواب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا' اُس نے دریافت کیا: ''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے اس اُمید کا اظہار کیا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور اُن تنظیموں کے اہم عہدوں پر فائز افراد امریکی معاشرے میں انفرادی طور پر نمایاں حیثیت کے مالک ہوتے ہیں' اس لیے اُنہوں نے ضرور اس حوالے سے کوئی پیش رفت کی ہوگی' ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ جب تک قانونی طور پر عدالت مسجد کو کھولنے کا حکم نہیں دیتی' اُس وقت تک ہم کسی دوسری مسجد میں جا کر نماز ادا کر لیا کریں' لیکن المیہ یہ تھا کہ ہم امریکہ میں تھے' یہ ہمارا ملک نہیں تھا جہاں ایک ہی محلے میں تین مختلف مکاتب فکر کی تین مختلف مساجد موجود ہوتی ہیں' ہمیں کسی دوسری مسجد تک جانے کے لیے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور روزمرہ کے معاملات میں اس بات کی گنجائش نہیں تھی کہ ہم روزانہ مسجد کا رخ کرتے' اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ ہم جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے ایک ساتھ کسی دوسری قریبی مسجد میں چلے جایا کریں گے' یہ طے کرنے کے بعد بقیہ تین افراد تو وہاں سے اُٹھ گئے' صرف محمد یوسف وہیں بیٹھا رہا' میں نے ابھی کچھ نہیں کھایا تھا' اس لیے کھانے کی چیز منگوا کر میں نے محمد یوسف کو بھی کھانے کی دعوت دی' وہ چینی نژاد شخص تھا اور میرا اُس سے کوئی سابقہ تعارف نہیں تھا' اُس نے مجھ سے باقی دن کی مصروفیت دریافت کی' اُس کے انداز سے محسوس ہوا کہ وہ کچھ وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتا ہے' کیونکہ مجھے لائبریری میں زیادہ ضروری کام نہیں تھا' اس لیے میں نے اُس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا' وہ مجھے ساتھ لے کر چائنا ٹاؤن آ گیا' چائنا ٹاؤن ایک ٹاؤن کی بجائے ایک پورا شہر ہے' جس میں آ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ عوامی جمہوریہ چین میں آ گئے ہیں' میں اس سے پہلے ایک مرتبہ کسی کے ساتھ یہاں آیا تھا' لیکن اُس وقت ہم یہاں کے ایک مشہور چینی ریستوران میں کھانا کھانے آئے تھے' میرا خیال تھا کہ محمد یوسف مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائے گا' لیکن راستے میں اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے ایک چینی دانشور سے ملوانے لے جا رہا ہے' جو بنیادی طور پر ایک بدھ راہب ہے' چینیوں کی روایتی زبان میں اُسے لامہ کہا جاتا تھا' یہ بالکل اُسی طرح تھا جیسے ہمارے مذہبی لوگوں کو مولوی یا مُلا کہا جاتا ہے' لامہ کے اصل نام کا تلفظ خاصا مشکل تھا' اس لیے میں نے اُسے لامہ کہہ کر ہی مخاطب کیا' دیکھنے میں وہ ایک عام سا راہب تھا' محمد یوسف نے میرا اُس سے تعارف کرواتے ہوئے یہ بات بیان کی کہ میں بھی ایک مسلمان ہوں اور میرا تعلق پاکستان سے ہے' پھر اپنی آمد کی غرض و غایت بتاتے ہوئے' مسجد سیل ہونے اور امام مسجد کی گرفتاری کا ذکر کر کے اپنی اس اُلجھن کا اظہار کیا کہ ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

محمد یوسف کا انگریزی بولتے ہوئے لہجہ عام امریکیوں جیسا تھا' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یوسف کی نشوونما امریکی معاشرے میں ہوئی تھی' جبکہ لامہ کی انگریزی بہت اچھی تھی لیکن اُس کا لہجہ اور تلفظ چینی تھا' اس لیے مجھے اُس کی بات سمجھنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی تھی' اُس نے اپنی بات کا آغاز اس نقطے سے کیا کہ دنیا بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے' مشرق اور مغرب۔

جب آپ مشرق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ مشرق ایک تابندہ اور روشن تاریخ کا مالک ہے' دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بانی اسی خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب آپ مغرب کو دیکھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ حال صرف مغرب کا ہے اور بظاہر مستقبل بھی اُسی کا نظر آتا ہے' دنیا میں جتنی بھی ترقی جہاں کہیں بھی ہوئی' اُس کا تمام تر سرچشمہ اہل مغرب کی تحقیق ہے' اُس میں انسان کی رہائش' لباس' ذرائع آمدورفت' ذرائع مواصلات سب چیزیں شامل ہیں' مشرق کا عہد گھوڑوں کے زمانے کا ہے' مغرب کا عہد ہوا میں اُڑنے کا زمانہ ہے' اس لیے مشرقی معاشرے کے مسائل' اُن کے اسباب محدود حیثیت رکھتے ہیں' جبکہ مغربی معاشرے کے مسائل اور اُن کے اسباب زیادہ وسعت کے حامل ہیں' اہل مشرق کی لڑائی اس بات پر ہوتی ہے کہ زمین کا چند فٹ کا یہ ٹکڑا میری ملکیت ہے یا ہمسائے کی ملکیت ہے' جبکہ اہل مغرب کا مسئلہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ پر آپ کی مخصوص جگہ کون سی ہے؟ اور اگر کوئی دوسرا شخص اس میں کوئی تصرف کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

مغربی معاشرے نے اپنی محنت' لگن اور جدوجہد سے پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹ دیا ہے اور سمٹی ہوئی چیزوں کو پھیلا دیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ لامہ اہل مغرب سے غیر ضروری طور پر متاثر ہیں' میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنے اس جملے کی وضاحت کریں' تو وہ بولے: ''پھیلی ہوئی چیز کو سمیٹنے کی مثال ذرائع نقل و حمل ہیں جنہوں نے پھیلے ہوئے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے' ذرائع مواصلات ہیں جنہوں نے دور کے رابطوں کو آسان کر دیا ہے' کئی ہزار میل دور کسی دوسرے ملک میں بیٹھا ہوا شخص بھی اُسی طرح آپ کا گاہک بن سکتا ہے جس طرح آپ کی دوکان میں کوئی گاہک داخل ہوتا ہے اور سمٹی ہوئی چیز کو پھیلانے کی مثال یہ ہے کہ صرف ایک انسانی جسم کی تحقیق کو پھیلا کر ہر ایک عضو کا الگ اسپیشلسٹ ہوتا ہے' سائنس کے ہر شعبے کے الگ الگ ذیلی شعبے بن گئے ہیں''۔

یہ ایک عام مشاہداتی حقیقت تھی جس میں کسی سائنس یا فلسفے یا غور و فکر کی ضرورت نہیں تھی' اس لیے مجھے اُلجھن محسوس ہوئی' ''میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ آپ کی اس وضاحت کا مقصد کیا ہے؟'' لامہ میری بات پر مسکرایا اور بولا: ''دنیا کے غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی آپ کو پینے کے لیے کوکا کولا مل جائے گی' رابطے کے لیے موبائل فون مل جائے گا' پہننے کے لیے تھری پیس سوٹ مل جائے گا' یعنی آپ اپنی ضروریاتِ زندگی میں سے اکثر شعبوں میں اہل مغرب کی پیروی کے محتاج ہیں' یہ آپ کی زندگی کا انفرادی پہلو ہے' آپ اپنی معاشرتی و اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں' ریاست کا نظام چلانے کے لیے عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ کی وہی شکل و صورت ضروری ہوتی ہے' جس کے خدوخال اہل مغرب نے ترتیب دیئے ہیں' آپ کے معاشرے میں وہ شخص عملی طور پر خوش حال ہوتا ہے جو اقوامِ مغرب کے فارمولوں کے مطابق ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مشرقی معاشروں میں وہ تعلیمی اور سماجی ادارے کامیاب ہوتے ہیں جن کی خدمات مغربی اداروں کے معیار کے قریب تر ہوتی ہیں اور پھر ہمارے معاشروں سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ براہِ راست اہل مغرب سے روشنی حاصل کرنا

چاہتے ہیں' تا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں جدید ترقی یافتہ دور کی تمام تر سہولیات حاصل کر سکیں اور پھر وہ یہاں آ جاتے ہیں' یہاں آ کر اُن کا یہ اصرار ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی اصل مشرقی یا مذہبی شناخت برقرار رکھنی ہے''۔

عمر رسیدہ لامہ کا اُٹھایا ہوا نقطہ اپنی جگہ اہم تھا' لیکن مجھ پر اُس وقت مذہبی جذباتیت طاری تھی' اس لیے میں نے کہا: ''محض کوکا کولا پی لینے سے' مغربی طرز کا لباس پہن لینے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہم اپنی مشرقی یا مذہبی شناخت کو خیر باد کہہ دیں'' میری بات پر لامہ نے مجھے سمجھایا: ''مشرقی اخلاقیات کا جائزہ لیں' ہندومت میں پنڈت' بدھ مت میں لامہ اور اسلام میں مُلا کو سب سے اہم معاشرتی مقام حاصل ہوتا تھا جواب نہیں ہے' آج کے معاشرے میں بڑے بزنس مین کو بلند معاشرتی مقام حاصل ہوتا ہے' اس کا مطلب کیا ہوا؟ کہ آپ کا معاشرہ اُن خطوط پر آگے بڑھ رہا ہے جو اہل مغرب نے مقرر کیے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آج آپ جیسا کوئی ذہین نوجوان معاشرے میں مذہبی حیثیت حاصل نہیں کرنا چاہتا' وہ ایک کامیاب کاروباری شخص' ڈاکٹر' انجینئر' وکیل' بینکر بننا چاہتا ہے اور یہ سب بن جانے کے بعد پھر اُسے یاد آتا ہے کہ میں نے اپنی مذہبی شناخت برقرار رکھنی ہے''میں اُس کی بات سن کر کافی دیر تک چپ رہا' پھر میں نے پوچھا: ''آپ کیا کہتے ہیں؟ ہم لوگوں کو ڈاکٹر' انجینئر نہیں بننا چاہیے؟'' اُس کی باتوں سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ مجھے یہی جواب دے گا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے' لیکن وہ بولا: ''ضرور بننا چاہیے لیکن ڈاکٹر اور انجینئر بن جانے کے بعد اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ ہم مذہبی اعتبار سے روایتی قدامت پسند رہیں گے''۔

میں نے لامہ کی اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''کمال ہے آپ جیسا مذہبی شخص مجھے یہ درس دے رہا ہے کہ مجھے مذہبی اعتبار سے قدامت پسند نہیں ہونا چاہیے' اگر کسی یونیورسٹی کے جدت پسند پروفیسر نے یہ بات کہی ہوتی تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا'' مجھے واقعی اُس کی باتیں سن کر دُکھ ہوا تھا اور میں حیران تھا کہ محمد یوسف مجھے اس شخص کے پاس کیوں لے کر آیا ہے؟ اب تک کی گفتگو میں محمد یوسف نے کوئی دخل نہیں دیا تھا کیونکہ کنٹین میں وہ مسجد سیل ہونے کے مسئلے پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا' اس لیے میرا یہی خیال تھا کہ شاید وہ بھی مذہبی جذبات رکھتا ہوگا' لامہ نے میری جذباتیت کا کوئی اثر نہیں لیا اور بولا: ''میرے بچے! تم مذاہب کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو' دنیا کے ہر مذہب کو معاشرتی سطح پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' اور تقریباً ہر مذہب کو بعد میں ریاستی اثر و رسوخ بھی حاصل ہوا' سابقہ ایک ہزار سال کے دوران عددی اعتبار سے سب سے زیادہ پھیلنے والا مذہب اسلام ہے' اس بات کا امکان موجود ہے کہ آگے آنے والے وقت میں امریکہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ اسلام کو یہاں بھی ریاستی اثر و رسوخ حاصل ہو' لیکن فی الحال ایسا نہیں ہے' آج کا امریکہ ایک آزاد جمہوری ملک ہے' امریکیوں نے یہ آزادی' یہ ترقی اس لیے حاصل نہیں کی ہے کہ مسلمان جہاد کا نعرہ لگاتے ہوئے یہاں اپنی حکومت قائم کر لیں'' میں نے اُس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے اُس کی بات کاٹ کر کہا: ''اس وقت امریکہ میں لاکھوں مسلمان

رہ رہے ہیں اور وہ سب ایک عام امریکی کی طرح امن کی زندگی گزار رہے ہیں' اُن کی کوئی جہادی تنظیم نہیں ہے' لامہ نے میری بات کاٹنے کا بُرا نہیں منایا' اُس نے وضاحت کی: ''ترقی کبھی بھی کسی ایک پہلو کے اعتبار سے نہیں ہوتی' انسان نے پہلے صرف دور کی آواز سننے کے لیے ٹیلیفون بنایا' پھر اُس کے ساتھ دور کی تصویر دیکھنے کی صلاحیت حاصل کی اور آج کے دور میں انٹرنیٹ نے اس سہولت کو نقطۂ کمال تک پہنچا دیا' آپ کو انٹرنیٹ پر ہر بیماری اور اُس کے علاج کے بارے میں تمام تر معلومات دستیاب ہو جائیں گی' تفریح کا کوئی بھی ذریعہ آپ اس واسطے سے حاصل کر سکتے ہیں' لیکن مسلمان انٹرنیٹ کو کس لیے استعمال کرتے ہیں؟ صرف جہادی پیغامات دینے کے لیے' انٹرنیٹ کے قیام کا یہ مقصد تو نہیں تھا' امریکہ' ہندوستان یا دنیا کے کسی بھی اور ملک میں آپ اگر ایسی کسی سوچ کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہاں کے رہنے والے چند نوجوان ریاست کا امن و سکون خراب کرنے کے درپے ہو جائیں تو یقینی طور پر ریاست اُن لوگوں کے خلاف اقدام کرے گی'' لامہ کی بات اب مجھے کسی حد تک سمجھ آنے لگی' وہ ایک روایتی مشرقی بدھ راہب تھا جو دھیمے لہجے میں رُک رُک کر اپنی بات مکمل کرتا تھا۔

اُس کی تمام تر گفتگو کا جو مفہوم میں سمجھ سکا تھا وہ یہ تھا کہ بعض مسلمان ایسا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جس کے حوالے سے بعض ممالک کی حکومتوں کے کچھ تحفظات ہوتے ہیں' جبکہ اکثر مسلمان اس نوعیت کی کاروائیوں سے لاتعلق ہوتے ہیں' لیکن عملی زندگی میں مسلمانوں کی اُس اکثریت کو اُن کاروائیوں کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں جو بعض مذہبی انتہاء پسند لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہیں' اب یہاں صرف ایک سوال سامنے آتا ہے' ان معاملات میں مذہبی انتہاء پسند اقلیت کا طرزِ عمل ٹھیک ہوتا ہے' یا عام اکثریت کو آپ درست قرار دیں گے' اور یہ مذہبی انتہاء پسند اقلیت' دنیا کے ہر مذہب میں پائی جاتی ہے' مسلمانوں سمیت عیسائیوں' ہندوؤں میں بھی ایسے کچھ افراد پائے جاتے ہیں جو دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ صرف ہتھیار کی زبان میں بات کرنے کے قائل ہوں' اس لیے ایک عام شخص کے سامنے صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ امن پسند اکثریت کو درست سمجھے اور اس بات کا اعتراف کرے کہ لڑنے بھڑنے کی شوقین اقلیت کا طرزِ عمل غلط ہے' خواہ اُن کا ہدف کسی بھی مذہب' کسی بھی ملک کے افراد ہوں۔

میرا یہ خیال تھا کہ بدھ راہب کی کچھ باتیں ٹھیک ہیں لیکن کیونکہ وہ اسلام اور مغرب کی جنگ میں براہِ راست فریق نہیں تھا' اس لیے اُسے صورتِ حال کا مکمل طور پر اندازہ نہیں تھا' میں نے اُس سے دریافت کیا: ''کیا آپ نے کبھی اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے؟'' اُس کا جواب اثبات میں تھا' اُس نے وضاحت کی: ''بہت سے معاملات میں اسلامی تعلیمات کو دنیا کے دیگر مذاہب پر فوقیت حاصل ہے' جس میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ ایک عام انسان کی طرح بھرپور معاشرتی زندگی گزاریں' یا پھر خلوت نشین ہو کر دنیا اور اُس کے معاملات سے مکمل طور پر لاتعلق ہو جائیں اور خدا کی راہ پر چل پڑیں''۔

عمر رسیدہ بدھ راہب ایک ذہین شخص تھا' اس نے اسلام کی تمام خوبیوں کو دو جملوں میں سمیٹ دیا تھا' میں نے اس سے سوال کیا: ''اگر اسلام اتنا ہی اچھا مذہب ہے تو آپ نے اسے اختیار کیوں نہیں کیا'' میری بات پر وہ مسکرایا' مجھے محسوس ہوا شاید وہ بھی یہی کہے گا کہ تمہیں اپنے مذہب کی تبلیغ کا بہت شوق ہے لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا'' دنیا کا ہر مذہب انسان کی بہتری کی تعلیم دیتا ہے' اسلام بھی ان میں شامل ہے لیکن جو گیان شاکیہ منی کی پیروی میں ہے وہ کسی اور مذہب کے بتائے ہوئے طریقے میں نہیں ہے'' مجھے معلوم تھا کہ شاکیہ منی بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کا لقب ہے' مجھے اسی وقت حاجی نزاکت کا خیال آیا' گل خان کا یہ کہنا تھا کہ حاجی نزاکت صاحب بھی کچھ ماروائی طاقت کے مالک ہیں' میں نے لامہ سے دریافت کیا: ''کیا آپ اپنے اس گیان کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟'' اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ گیان' روح کی بالیدگی کے طریق کار کو کہتے ہیں' میں نے اس سے روح کی بالیدگی کے فوائد دریافت کیے تو اس نے بتایا کہ کڑی تپسیا کے نتیجے میں انسان کو عام انسانوں سے بڑھ کر ذہنی و جسمانی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے' جس کے نتیجے میں آپ وہ کچھ دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں' جو عام انسانوں کے حواس کے دائرے سے باہر ہوتا ہے' میں نے اس سے دریافت کیا: ''آپ اپنے گیان کی روشنی میں میرے بارے میں کیا کہیں گے؟'' وہ بولا: ''گیان دھیان اس لیے نہیں ہوتے کہ انسان مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں کرنے کی دکان کھول لے' تاہم پھر بھی میں تمہاری تسلی کے لیے یہ بتائے دیتا ہوں کہ تم مجھ سے پہلے کسی بڑے گیانی سے مل چکے ہو'' میں چند لمحوں کے لیے مبہوت رہ گیا' یہ بدھ راہب کیا چیز ہے؟ کیا حاجی نزاکت واقعی کوئی ''بڑے گیانی'' ہیں؟ مجھے یاد آیا حاجی صاحب نے بھی ایک فرضی داستان کے طور پر میرے ساتھ بیتنے والے واقعات بیان کیے تھے' میں نے مسحور لہجے میں دریافت کیا: ''اور میرا مستقبل؟'' قدرے توقف کے بعد اس نے جواب دیا: ''دنیا میں دو طرح کے کام ہوتے ہیں صحیح یا غلط' انسان کو ہمیشہ صحیح کام کرنا چاہیے'' مجھے اس کا جواب سمجھ نہیں آیا لیکن میں نے اس سے وضاحت نہیں مانگی' البتہ یہ سوال کیا: ''آپ سے پہلے میں جس ''گیانی'' سے ملا ہوں ان کا مذہب مختلف تھا' تو سوال یہ ہے کہ آپ دونوں میں سے کس کا گیان صحیح ہے اور کس کا غلط؟'' میرے سوال پر لامہ مسکرایا'' حقائق دو طرح کے ہوتے ہیں' ایک قسم آفاقی ہوتی ہے جیسے سورج روشن ہے' چاند رات میں ہی نکلتا ہے' ہوا چلتی ہے' دوسری قسم کا تعلق دریافت سے ہوتا ہے' جیسے بٹن دبانے سے بلب کا روشن ہو جانا' پہلے زمانے کے لوگوں کو اس حقیقت کا نہیں پتا تھا' اب یہ ایک معروف چیز ہے' گیان کی مثال پرواز کی طرح ہوتی ہے' مکھی کی پرواز کی بلندی محدود ہوتی ہے' شہباز کی پرواز کی بلندیاں اور ہوتی ہیں' دونوں کا اپنا اپنا دائرہ کار ہے' دونوں میں سے ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ میں اپنی بساط کے مطابق بلند ترین پرواز کر رہا ہوں'' اسی وقت میرے فون کی بیل ہوئی' میں نے لامہ سے معذرت کر کے فون جیب سے نکالا تو سکرین پر لینڈ لائن کا کوئی اجنبی نمبر تھا' میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ یہ کسی پولیس اسٹیشن یا کسی ایجنسی کے دفتر کا نمبر ہوگا' میں نے کال

ریسیو کی' تو دوسری طرف عذرا تھی' اس کی وہی نرم و دلکش آواز اور باوقار لہجہ' گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں' اس نے پہلے تو مجھ سے یہ دریافت کیا کہ میں مصروف تو نہیں ہوں' لامہ کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے نفی میں جواب دیا تو اس نے بتایا' وہ اپنی دونوں بیٹیوں سمیت نیویارک پہنچ چکی ہے اور اپنی خالہ زاد کے ہاں ٹھہری ہے' کل وہ مجھ سے ملنے یونیورسٹی آئے گی اور باقی تفصیلی گفتگو ملاقات کے دوران ہوگی' اس نے فون بند کیا تو میں دوبارہ لامہ کی طرف متوجہ ہوا لیکن اب میری طبیعت لامہ' اس کے گیان' فلسفے' تجربے ہر چیز سے اچاٹ ہوگئی تھی' لامہ کی بات جہاں سے منقطع ہوئی تھی' اس نے وہیں سے آغاز کیا' لیکن اب کی بار میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا' اس لیے اسے جلد ہی اس بات کا احساس ہوگیا کہ میں ذہنی طور پر وہاں حاضر نہیں ہوں' اس نے دعا دی: ''میرے بچے! شاکیہ منی تمہاری حفاظت کرے!'' یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب ہمیں وہاں سے اُٹھ جانا چاہیے۔ ہم محمد یوسف کے گھر آ گئے' اس کا باپ فوت ہو چکا تھا البتہ ماں زندہ تھی' اس سے مل کر احساس ہوا کہ دنیا کی تمام مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں' نیویارک میں رہتے ہوئے بھی انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ مجھے ''باہر'' کا کھانا نصیب ہوتا ہے' وہ ایک سیدھی سادی روایتی مشرقی عورت تھی' محمد یوسف نے بتایا: پہلے پہل اس کے مرحوم والد نے اسلام قبول کیا تھا' پھر ان کی شریک حیات بھی مسلمان ہوگئیں' یوسف اور اس کے بہن بھائی بھی ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے مسلمان ہو گئے' ان کے بعض چینی رشتے داروں نے ان کے مذہب تبدیل کرنے کی بھرپور مخالفت کی' لیکن اس کے باپ نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا' عمر رسیدہ بدھ راہب سے یوسف نے مارشل آرٹ سیکھا تھا' لامہ نے کبھی یوسف کے ساتھ مذہب کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی' تاہم یوسف کو یہ یقین تھا کہ لامہ کا تجربہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے' اسی لیے وہ مجھے اس سے ملوانے لے آیا تھا۔

اپنے ہاسٹل واپس آیا تو میرے کرنے کے بہت سے کام ادھورے پڑے تھے' لیکن میرا کسی کتاب کو ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا' بے خیالی میں اسی گیت کے بول میں گنگنانے لگا جو چند دن پہلے سونیا کے کمرے میں سنا تھا' بے چین نظر بے تاب جگر' یہ دل ہے کسی کا دیوانہ' کب شام ہو اور وہ شمع جلے' کب اُڑ کر پہنچے پروانہ' اس سے زیادہ بول مجھے نہیں آتے تھے' اس لیے میں انہیں ہی دہراتا رہا' گزرے ہوئے وقت کی بہت سی یادیں تنگ کرتی رہیں' جن میں آنسو اور ہنسی دونوں شامل تھے' یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا' میں نے خواب دیکھا' میں پاکستان میں ہوں اور ایک ٹرین میں بیٹھا ہوں' ٹرین شہری آبادی سے گزر رہی ہے اور اس کی رفتار آہستہ ہو رہی ہے' یوں جیسے وہ اسٹیشن پر رکے گی' میں دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہوں' میرا ڈبہ انجن کے بعد والا ہے' پلیٹ فارم کے ساتھ سے گزرتے ہوئے میری نظر عذرا اور ڈورتھی پر پڑتی ہے' وہ دونوں آرام سے اپنے سامان کے ساتھ فرش پر بیٹھی ہیں' یوں جیسے انہوں نے اس ٹرین میں سوار نہیں ہونا' میں انہیں آواز دیتا ہوں لیکن میری آواز شاید ان تک نہیں پہنچتی' میں سوچتا ہوں پلیٹ فارم کے آخری سرے پر میرا ڈبہ رکے گا تو میں دوڑ کر ان کے پاس جاؤں گا لیکن نصف پلیٹ فارم عبور کرنے کے بعد ٹرین کی رفتار انتہائی تیز ہو جاتی ہے'

ایک سیکنڈ میں اسٹیشن اور پلیٹ فارم میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں' ٹرین کی رفتار کسی جہاز سے زیادہ تیز تھی اور انجن کا ہارن مسلسل بج رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی' چند لمحوں بعد حواس بحال ہوئے تو پتہ چلا کہ موبائل بج رہا ہے' اسے اٹھا کر دیکھا تو الارم بج رہا تھا' صبح کے سات بج چکے تھے' میں تیزی سے اُٹھا' تیار ہو کر یونیورسٹی آ گیا' خالی الذہنی کے عالم میں لیکچر اٹینڈ کیا اور پھر سکول آف اپلائیڈ بیالوجی کی لائبریری کے باہر پڑے ہوئے سنگی بینچ پر آ کر بیٹھ گیا' میں نے عذرا کو یہیں آنے کا کہا تھا' کیونکہ کنٹین میں کوئی بھی واقف مل سکتا تھا' جبکہ میرے اپنے سکول آف لاء میں بھی یہی خدشہ تھا کہ کوئی مجھ سے ملنے آ سکتا تھا' سکول آف بیالوجی کی عمارت الگ تھلگ تھی' یہاں کسی شناسا سے سامنا ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں اس کی آمد کے راستے پر نگاہ جما کے بیٹھا ہوا تھا کہ میری نگاہ دھندلا گئی' وہ وہی تھی' میں بے اختیار کھڑا ہو گیا' وہ میرے قریب آئی تو اس کی آنکھوں سے بھی اشک رواں تھے' اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے سلام کیا' میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لوں' لیکن.......... میرے اور اس کے درمیان ہماری اخلاقیات' ہماری مشرقی تہذیب حائل تھی' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا' اپنے جذبات سے توجہ ہٹا کر میں نے اسے دیکھا تو وہ بہت کمزور ہو چکی تھی' یوں جیسے کافی عرصہ بیمار رہی ہو' اس کی آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں اور ان کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے' پرسش احوال کے دوران میں نے اس کے شوہر کی خیریت دریافت کی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

تقریباً آٹھ سال پہلے میں نے پہلی مرتبہ عذرا کو دیکھا تھا' میں اس وقت گریجویشن کر رہا تھا' وہ مجھ سے ایک سال جونیئر تھی' کالج کے کسی فنکشن میں اس نے اقبال عظیم کی مشہور غزل سنائی تھی' مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا' اگرچہ مجھے شاعری سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی' لیکن اس کے لہجے اور پڑھنے کے انداز نے' دیگر سامعین سمیت مجھ بھی بہت متاثر ہوا تھا' غزل کے یہ دو اشعار تو مجھے بہت پسند آئے تھے:

مجھے جو بھی دشمنِ جاں ملا' وہی پختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی' نہ کسی کا تیر خطا ہوا

ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریکِ بزمِ خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا

ایسا نہیں تھا کہ یہ اشعار اس کی زبانی سنتے ہی مجھے فوراً یاد ہو گئے تھے' بلکہ بعد میں میری فرمائش پر اس نے یہ پوری غزل میری ڈائری پر لکھی تھی' وہ خواب دیکھنے والی ایک کومل سی لڑکی تھی' خواب میں بھی دیکھتا تھا' لیکن میکانکی نوعیت کے' ہمارے مزاجوں کا یہی اختلاف شاید ہمارے ایک دوسرے کو پسند کرنے کا سبب بنا تھا' معاملات کے بارے میں اس کا رویہ مکمل طور پر تصوراتی ہوتا تھا' جبکہ میں جمع تفریق

کر کے نتیجہ نکالتا تھا' ایک برس گزر گیا' ہم اس دوران ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے' لیکن یہ میری غلط فہمی تھی' اس کی ذات کے حوالے سے میں تصورات کی دنیا میں رہتا تھا' یہی وجہ ہے کہ جب اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس کے والد اپنے کسی قریبی عزیز کے بیٹے کے ساتھ اس کا رشتہ طے کر رہے ہیں تو پہلے مجھے یقین نہیں آیا' میرے خیال کے مطابق اسے اپنے گھر والوں کے سامنے واضح کر دینا چاہیے تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے' لیکن اس کی جمع تفریق یہ کہتی تھی' مشرقی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اسے باپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے اور اس نے ایسا ہی کیا' اپنی شادی سے تین دن پہلے اس نے آخری مرتبہ مجھے فون کیا تھا' روتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی تھی۔

آج میں نے اس کے شوہر کا حال پوچھا تو وہ پھر رو پڑی تھی' اس نے خود پر قابو پا کر جواب دیا: ''میں تمریز سے جھگڑ کر یہاں آئی ہوں'' تمریز اس کے شوہر کا نام تھا' جو اسے بیاہ کر اپنے ساتھ امریکہ لے آیا تھا' یہاں آ کر پتہ چلا تمریز میں وہ تمام خامیاں بدرجہ اتم موجود ہیں' جو مشرق کے پابند ماحول سے مغرب کی آزاد فضاؤں میں آنے والے اکثر نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں' تمریز بہت جلد شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کا عادی ہو کر گھر میں بیٹھ گیا اور گھر کی ساری ذمہ داری عذرا کے سر آن پڑی' پاکستان میں وہ گریجویشن بھی مکمل نہیں کر سکی تھی' اس لیے یہاں اسے ریسٹورنٹ میں کام کرنا پڑا' صبح کے وقت وہ گھر کے کام نمٹاتی تھی اور دوپہر سے لے کر رات گئے تک ملازمت کرتی تھی' اس نے نہیں بتایا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے روزانہ سینکڑوں برتن دھونے پڑتے ہوں گے' امریکہ میں بندہ مزدور کے اوقات کتنے تلخ ہوتے ہیں' اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہو گیا تھا جب یہاں آنے کے فوراً بعد میں نے بھی ایک ہسپانوی ''ٹیک اوے'' میں کام کرنے کی کوشش کی تھی' وہ کوئی بڑا ریسٹورنٹ نہیں تھا' پھر بھی پہلے دن میرے سامنے پیازوں کی بوری رکھی گئی اور اسے چھیلنے کا حکم ملا' اسے چھوڑ کر بھاگا' ٹیکسی چلانی شروع کی' تیسرے ہی دن دو نوجوان لڑکے میری ٹیکسی میں بیٹھے ایک ویران مقام پر انہوں نے ٹیکسی رکوا کر مجھے باہر نکال کر مار پیٹ کی اور میری جیب میں موجود پچیس ڈالر چھین کر لے گئے' کسی نے سیکورٹی گارڈ بننے کا مشورہ دیا' تو پتہ چلا اس کی ڈیوٹی بارہ گھنٹے ہوتی ہے۔ یہ نوکری کرتا تو پڑھائی متاثر ہوتی' ابتدائی چار ماہ اسی طرح گزر گئے تھے' پھر مجھے پی ایچ ڈی سکالرز کے ساتھ اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا تو کچھ سکھ کا سانس نصیب ہوا' لیکن اس کے باوجود میں بہت مشکل سے اپنا خرچ پورا کر پاتا تھا۔

اب عذرا بتا رہی تھی وہ پچھلے چھ سال سے ریسٹورنٹ میں کام کر رہی ہے'' ''اس کا مطلب ہے تمہارے شوہر میں ایک اچھے ولن کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں'' میں نے متاسف لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی: ''زندگی کی فلم کا ولن ''مقدر'' ہوتا ہے'' میں نے اس کی بات سے اختلاف کیا: ''مقدر' زندگی کی فلم کا ڈائریکٹر ہوتا ہے'' اس نے نفی میں سر ہلایا: ''اگر مقدر ڈائریکٹر ہوتا تو ہیرو ہیروئن کو ایک دوسرے سے ملوا دیتا'' اس نے کیا خیال آفریں بات کہی تھی' میں دہرے ملال کا شکار ہو چکا تھا' پہلے اسے نہ پانے کا غم تھا' اب اس کی حالتِ زار کا افسوس بھی

بیچ میں شامل ہوگیا تھا' میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا' یہاں آنے کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی پاکستان واپس نہیں گئی' اس نے اپنے گھر والوں کے سامنے یہ ظاہر کیا ہے' وہ یونیورسٹی میں شام کی کلاسز اٹینڈ کرتی ہے' مجھے اس کی بات ذرا دیر سے سمجھ آئی' کیونکہ اس نے دوپہر سے رات گئے تک کام کرنا ہوتا تھا' اس لیے وہ دن کے ابتدائی حصے میں پاکستان فون کرتی تھی' اس وقت پاکستان میں علی الصبح کا وقت ہوتا تھا' بیرونِ ملک تفصیلی بات چیت کے لیے یہ وقت نامناسب محسوس ہوتا' اس لیے اس نے یہ بہانہ کیا تھا۔

وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا' مجھے یاد آیا وہ خاصی دیر سے میرے ساتھ ہے اور ہم نے کچھ کھایا پیا نہیں ہے' میں اسے ساتھ لے کر کنٹین کی طرف چل پڑا' ہم ماضی کے خوشگوار لمحوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے کنٹین میں داخل ہوئے' عذرا کے متوجہ کرنے پر میں نے دیکھا' جولیا ایک میز پر اکیلی بیٹھی تھی اور ہاتھ اٹھا کر ہمیں اپنی میز پر آنے کی دعوت دے رہی تھی' ہم اس کے پاس پہنچے تو اس نے اُٹھ کر بازو پھیلا دیئے' عذرا سے گلے ملتے ہوئے اس کے دونوں گالوں پر چٹاخ چٹاخ بوسے دیئے' یوں جیسے وہ اس کے بچپن کی گہری سہیلی ہو عذرا اس التفات کی توقع نہیں کر رہی تھی' اس لیے خاصی حیران تھی' تھوڑا سا حیران میں بھی تھا' ''تم سے مل کر بہت بہت خوشی ہوئی'' اس کی خوشی اس کے لہجے سے ظاہر تھی' ''یہ'' میں نے تعارف کروانا چاہا' تو اس نے میرا جملہ درمیان میں سے ہی اچک لیا' ''عذرا ہیں'' میں حیران ہوا' ''تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' میرے دریافت کرنے پر اس نے کہا: ''آئینے میں جا کر اپنا چہرہ دیکھو کیسے کھلا ہوا ہے؟ دوسرا یہ کہ تم نے بتایا تھا عذرا آنکھوں میں ڈھیر سارا کاجل لگاتی ہے' یہاں تمہیں ایسی کوئی لڑکی نہیں ملے گی جس نے صرف کاجل لگایا ہو باقی میک اپ نہ کیا ہو' تیسرا یہ کہ تم اس کے قرب میں آس پاس سے یکسر غافل تھے' تم نے میرا اشارہ نہیں دیکھا' کنٹین میں ایک اور شخص نے بھی اشارے کے ذریعے تمہیں متوجہ کرنا چاہا تھا' لیکن تمہیں آس پاس کی خبر ہی کہاں تھی؟'' جولیا کے کہنے پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو دیوار کے ساتھ ایک میز پر حسن البکر اپنے کچھ ساتھیوں سمیت بیٹھا تھا' میں نے جلدی سے جولیا کا تعارف کروایا' ''یہ میری بہترین دوست نہیں کہوں گا' میری محسن مہربان ہیں' جولیا'' عذرا کو جولیا کے ساتھ بیٹھنے کی ہدایت کر کے میں حسن البکر کے پاس آیا' وہ لوگ اس بات پر بحث کر رہے تھے' آج جمعرات تھی کل جمعہ کی نماز وہ کہاں ادا کریں؟ میں نے انہیں مشورہ دیا' ہم متعلقہ پولیس اسٹیشن جا کر دریافت کرتے ہیں کہ کس بنیاد پر مسجد کو سیل کیا گیا ہے؟ پھر متعلقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں یہ درخواست دیتے ہیں کہ ہمیں اپنی ہفتہ وار عبادت کی ادائیگی کے لیے صرف جمعہ کی نماز کے لیے مسجد کھولنے کی اجازت دی جائے' اگر مجسٹریٹ اجازت دے دیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کسی اور مسجد میں جا کر نماز ادا کر لیں گے'' ''بالفرض اگر مجسٹریٹ مسجد کھولنے کی اجازت دے دیتا ہے تو سوال یہ ہے کہ نماز کون پڑھائے گا؟'' مجھے مسلمانوں کی اس اجتماعی کمزوری کا علم تھا وہ بڑی شدومد کے ساتھ نماز باجماعت میں شریک ہوتے ہیں' لیکن کوئی بھی شخص آگے بڑھ کر نماز پڑھانے کی ہمت نہیں کرتا' یہ کام صرف امام ہی کر سکتا ہے' جس کا یہ پروفیشن ہے۔

یہی وجہ تھی کہ امام کے بغیر مسلمانوں کی اجتماعیت صرف ایک ریوڑ کی شکل میں رہ جاتی تھی اور اس اجتماعی نفسیات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ عام مسلمان جب کسی مذہبی تنظیم یا گروپ میں شمولیت اختیار کرتا ہے' خواہ وہ تنظیم یا گروپ جہاد کی ترغیب دینے والے ملاؤں کا ہو یا روحانیت کے دعویدار پیروں' فقیروں کا ہو۔ ایک عام مسلمان جب ان میں سے کسی ایک کا معتقد بنتا ہے تو اس کا اعتقاد اندھا ہوتا ہے' اور وہ یہی سمجھتا ہے کہ دین و دنیا کی تمام ترفوز و فلاح اُس عالم یا صوفی کی پیروی میں ہے۔

ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ہمارا امام مسجد گرفتار ہو چکا تھا اور مسجد سیل ہو چکی تھی' کہنے کو تو میں نے مجسٹریٹ کی عدالت میں درخواست دینے کا مشورہ دے دیا تھا' لیکن عملی حقیقت یہ تھی کہ اگر یہ صورت ممکن ہوتی تو مسجد کی انتظامیہ ہم سے پہلے اس پر عمل پیرا ہو چکی ہوتی' کچھ دیر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر میں واپس اپنی ٹیبل پر آیا تو اس مختصر سے وقت میں جولیا اور عذرا ایک دوسرے کی گہری سہیلیاں بن چکی تھیں' یہ بات اس سے پہلے بھی میرے مشاہدے میں آ چکی تھی کہ دو اجنبی مرد ایک دوسرے سے شناسا اور بے تکلف ہونے میں خاصا وقت لیتے ہیں جب کہ دو عورتیں بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد عذرا نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو جولیا نے اُسے گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی' عذرا کو اُس کی خالہ زاد بہن کے گھر پہنچا کر جولیا نے مجھے ہاسٹل تک پہنچانے کا عندیہ ظاہر کیا تو میں نے اُسے ہدایت کی' وہ مجھے شہر کے درمیان کسی بارونق جگہ پر اُتار دے ''کیوں' موج مستی کا پروگرام ہے؟'' اُس نے شوخ لہجے میں دریافت کیا: میں نے وضاحت کی: میں دراصل ایف بی آئی کے آفیسر انتھونی زینگر سے ملنا چاہتا ہوں۔

مین ہٹن کی ایک معروف شاہراہ کے کنارے جولیا نے مجھے اتار دیا۔ میں پاس موجود سپر سٹور کے اندر آیا اور انتھونی کو کال کی' میں نے اُسے اپنی مسجد سیل ہونے اور امام کی گرفتاری کے بارے میں بتا کر یہ درخواست کی کہ ایک عام انسان ہونے کے ناطے وہ میری رہنمائی کرے کہ اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے' اُس نے پوری توجہ سے میری بات سنی' مسجد کا ایڈریس نوٹ کیا اور پندرہ منٹ بعد جواب دینے کا وعدہ کیا' میں نے سوچا یہ مختصر سا وقت میں سٹور میں گھوم پھر کے گزار دیتا ہوں۔

انسانی نفسیات کا یہ پہلو بہت عجیب ہے کہ انسان ہمیشہ اپنی پسند اور ضرورت کی چیزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے' میرے سامنے مختلف نوعیت کی بے شمار اشیاء بکھری ہوئی تھیں' لیکن میری توجہ اُن کی طرف مبذول نہیں ہوئی کیونکہ میں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا قائل تھا' مجھے معلوم تھا میں ان میں سے کوئی بھی چیز خرید نہیں سکتا' میرا ذہن عذرا میں اُلجھا ہوا تھا' وہ نیویارک آ تو گئی تھی لیکن آخر وہ کتنے دن اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں رہ پائے گی' امریکہ میں تو کام کر کے گزر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کوئی کام کیے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے' تو کیا اُسے یہاں بھی روزانہ ہزاروں پلیٹیں اور چمچ دھونا پڑیں گے' یہ سب میں کیسے گوارا کروں گا اور اگر میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تو پھر نظام کیسے چلے گا' امریکیوں کی معاشرتی اخلاقیات کا یہ پہلو بہت تکلیف دہ ہے' اگرچہ دیگر مغربی ممالک میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے لیکن لندن'

پیرس اور نیویارک جیسے بڑے شہروں میں تو گھر کے ہر فرد کو ان تھک محنت کرنا پڑتی ہے اور اس حوالے سے میاں بیوی، باپ بیٹی، محبّ اور محبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا' میں انہیں خیالوں میں گم تھا کہ میرے موبائل کی بیل بجی' دوسری طرف انتھونی زینگر تھا' اُس نے مجھے بتایا' سی آئی اے کو یہ اطلاعات ملی ہیں کہ اُنہیں مطلوب بعض افراد اُس امام کے ہاں قیام کر چکے ہیں اور اس بات کا شبہ موجود ہے کہ مسجد کے نمازیوں میں بھی بعض افراد مشکوک ہو سکتے ہیں' میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے نرم لہجے میں دریافت کیا: ''کیا سی آئی اے کے پاس اس بارے میں ٹھوس ثبوت موجود ہیں'' اُس نے جواب دیا: ''میں جج نہیں ہوں اور سی آئی اے کے افسران میرے ذاتی ملازم بھی نہیں ہیں' وہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے فرائض کس طریقے سے سرانجام دینے ہیں؟'' میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کال منقطع کر دی' سٹور کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا ئبیٹ کیفے تھا۔ میں وہاں آیا اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر نیویارک کی مختلف مساجد کے بارے میں معلومات سرچ کرنے لگا لیکن کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا' اس سے تو بہتر یہی تھا کہ میں جولیا کے ساتھ بیٹھ کر اپنے ہاسٹل چلا جاتا جہاں میرے کرنے کا بہت سا کام جمع ہو چکا تھا' پردیس کا سب سے بڑا عذاب تنہائی ہوتی ہے' دو کروڑ سے زائد آبادی والے اس شہر میں اُس وقت میں خود کو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی پر اکیلا بیٹھا ہوا ہوں' مجھے اس سے پہلے بھی اس بات کا اچھی طرح شعوری احساس ہو چکا تھا۔ دنیا کی تمام تر رنگینی و رعنائی انسان کی اپنی ذہنی کیفیت کے دم سے ہوتی ہے' اگر آپ کا اندر ویران ہے تو آس پاس کا ہجوم آپ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اور اگر آپ کا باطن مطمئن ہے تو ویرانہ بھی آباد محسوس ہوتا ہے۔

اگلے دن میں حسن نے الکبر اور سفیان کے ہمراہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے گیا۔ مسجد کا انتخاب حسن الکبر نے کیا تھا وہ ایک بڑی مسجد تھی مکمل بھری ہوئی تھی۔ امریکی حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اور امریکی معاشرے میں بعض حوالوں سے مسلمانوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ ان باتوں نے امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے مذہب کی طرف زیادہ راغب ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ امام صاحب نے اپنی تقریر کے آخر میں یہ اعلان کیا مسجد کے ساتھ عمارت اسلامک سنٹر کی ہے۔ جہاں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد تقریب ملاقات کا اہتمام ہوتا ہے۔ جن حضرات کے پاس وقت ہو وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں سے تعارف و ملاقات کے لیے شریک ہو سکتے ہیں۔ میرے پاس کرنے کو بہت سا کام تھا لیکن ذہن ابتری کا شکار تھا۔ اس لیے نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد وقت گزاری کے خیال سے میں بھی وہاں رک گیا چند لوگوں سے سے تعارف ہوا وہ سب لوگ بے لوث اور مخلص تھے یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ زبان، رنگ نسل پیشے خطے کے اعتبار سے مختلف لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تھے ان کے درمیان رشتہ اور تعلق صرف مذہبی اخوت کا تھا ان میں سے ایک بزرگ پاکستانی تھے ابرار احمد ساٹھ کی دہائی میں امریکہ آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہت کم لوگ امریکہ کا رخ کرتے تھے پاکستان اور ایران سمیت بیشتر اسلامی ممالک کے ساتھ امریکہ کے بہت قریبی دوستانہ تعلقات تھے ابتدائی چند برسوں تک بھرپور محنت کرنے کے بعد ابرار احمد اس لائق ہو گئے کہ اپنے بیوی اور بچوں کو بھی امریکہ لے آئے۔ انہوں نے امریکی شہریت حاصل کر لی تھی۔ ان کے بچے بڑے ہو کر صاحب اولاد ہو گئے ان کی اہلیہ داغ مفارقت دے گئیں۔ زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے درمیان میں ایک دو مرتبہ انہوں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ بھی کیا پاکستان چلے بھی گئے۔ لیکن وہاں کے حالات کی وجہ سے تائب ہو کر واپس آ گئے۔ وہ پچھلے پندرہ سال سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت اسلامک سنٹر میں گزرتا تھا۔ جو ایک کمیونٹی سنٹر تھا۔ یہاں ان کا وقت اچھا پاس ہو جاتا تھا۔ ہم چار افراد ایک حلقہ بنا کر بیٹھے تھے نشست فرشی تھی ابرار احمد ان کی جواں سال پوتی ہالہ، مظفر گڑھ کے رہائشی زاہد کوریجہ جو یہاں ٹیکسی چلاتے تھے اور میں کیونکہ ہم چاروں پاکستانی تھے اس لیے بات چیت اردو میں ہو رہی تھی ہالہ مفہوم سمجھ لیتی تھی لیکن اسے اردو بولنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ابرار صاحب سے دریافت کیا ''اتنے عرصے سے آپ یہاں مقیم ہیں۔ آپ نے امریکہ کو کیسا پایا؟'' یہ بہت عام سوال تھا۔ لیکن ان کے تجربے کی وجہ سے کچھ مختلف جواب ملنے کو توقع کی تھی۔ ویسے بھی میں ان سے سٹاک ایکسچینج کے بھاؤ کیرانائٹلے کی نئی ریلیز ہونے والی فلم لاس ویگاس کی تفریح گاہوں کے بارے میں تو نہیں پوچھ سکتا تھا۔

انہوں نے جواب دیا۔ ''امریکیوں کا دین ایمان صرف ڈالر ہے۔ انہوں نے افغانستان اور عراق میں اپنی افواج کیوں بھیجی ہیں؟ ڈالرز کے لیے انہوں نے بتایا عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے۔ امریکی یا مغربی لوگ جھوٹ نہیں بولتے دھوکہ نہیں دیتے، یہ تصور غلط ہے دراصل انہوں نے اپنا معاشرتی ڈھانچہ اس طور پر ترتیب دیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو معاملات میں دھوکہ دینے کی کوشش کرنا چاہے تو

سے یہ خوف ہوگا کہ میں قانون کی گرفت میں آ جاؤں گا۔ اگر لین دین کرتے ہوئے کوئی شخص کمی بیشی کرتا ہے تو اس کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو ان کا معاشی نظام کبھی کا تباہ و برباد ہو چکا ہوتا۔ لیکن آپ دوسری طرف دیکھیں امریکہ میں وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والے لوگ بھاری معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر غیر قانونی فوائد کو قانون کی حدود میں حاصل کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ وہی کچھ دکھاتے ہیں۔ جو حکومت کی پالیسی ہوتی ہے۔ اور رہے حکومتی ترجمان، تو ان کا کام ہی غلط بیانی کرنا ہے۔ یہ سب سننے کے بعد مجھے بجا طور پر ان سے یہ سوال کرنا چاہیے تھا۔ پھر آپ امریکہ میں مقیم کیوں ہیں؟ میں نے ان سے یہی سوال کر دیا تو وہ بولے تم" کبھی کراچی ائرپورٹ پر کھڑے ہو کر مشاہدہ کرو، بیرون ملک سے آنے والے مہمان اور اس کے استقبال کے لیے میزبانوں کے لباس، بالوں کے انداز، ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل اور چہرے پر موجود تاثر سمیت ہر چیز میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ بس یہی خود ساختہ احساس تفاخر ہے۔ جو ہمیں اپنوں سے، اپنی مٹی سے دور رکھتا ہے۔ اور کہنے کو ہم یہ کہہ دیتے ہیں امریکہ میں تعلیم بہت اچھی ہے۔ صحت کی تمام سہولیات حاصل ہیں۔ یہ ہے اور وہ ہے۔ ارے بھئی ہم کون سا کسی ہسپتال میں پیدا ہوئے تھے تو اگر گھر میں مر بھی گئے تو کون سی قیامت آ جائے گی اور اگر آ بھی گئی تو اس نے ایک دن تو آنا ہی ہے۔ ویسے بھی امریکہ میں رہنے والے لوگ کون سا ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ کم از کم آدمی کو اپنی مٹی تو نصیب ہونی چاہیے۔

امریکہ میں رہنا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ مجھے آئندہ چند روز میں ہو گیا جب میرے دو ٹیچرز نے مجھے تنبیہ کی کہ میری کارکردگی کا گراف نیچے جا رہا ہے۔ جس پی ایچ ڈی سکالر کے اسسٹنٹ کے طور پر میں کام کر رہا تھا۔ اس نے بھی گلہ کیا کہ میں پوری توجہ نہیں دے پا رہا یونیورسٹی میں میرا اب تک کا تعلیمی ریکارڈ قابل رشک تو نہیں البتہ بہتر ضرور تھا۔ جس پر سوالیہ نشان اٹھنا شروع ہو گئے تھے دوسری طرف عذرا سے ملنے میں مشکل پیش آ رہی تھی کیونکہ ٹیکسی میں سفر کرنے کی میری اوقات نہیں تھی۔ اور لوکل ٹرین کے ذریعے وقت بہت لگ جاتا تھا۔ عذرا کو اپنی میزبان کے ہاں رہتے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ چند ایک ڈالر کی جو جمع پونجی اس کے پاس تھی وہ ختم ہونے والی تھی پھر اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ مجھے کسی نے مشورہ دیا تم کچھ لکھنے کی کوشش کرو، کیونکہ امریکہ میں ذرائع نشر و اشاعت بہت ترقی کر چکے ہیں۔ مارکیٹ بہت بڑی ہے۔ پبلشرز بہت ہیں۔ لیکن لکھنے والے کم ہیں میں نے خود انٹرنیٹ پر سرچ کیا تو بہت سے پبلشرز کی طرف سے یہ آفر موجود تھی ہم ہر مہینے دس نئی کتب شائع کرتے ہیں۔ آپ اپنا مسودہ ہمیں بھجیں میں نے راتوں کو جاگ کر ایک کہانی لکھی مختلف رسالوں کو ای میل کے ذریعے بھیجی۔ لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ انسان کی فطرت میں عجلت کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ میں نے سونیا کماری کو اپنی کہانی پڑھنے کے لیے دی اس نے میرے پاس بیٹھ کر ہی پہلا صفحہ پڑھا، درمیانی صفحات پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، کہانی کا آخری پیراگراف غور سے پڑا، پڑھنے کے دوران اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے کہانی مجھے واپس کرتے ہوئے وہ بولی۔

"جس چیز کو تم نے رومانس کے طور پر پیش کیا ہے یہ ہمارے ہاں ہندوستان پاکستان میں رومانویت سمجھی جاتی ہے۔ تھوڑا سا مرچ مصالحہ لگا کر یہ درمیانے درجے کی کسی انڈین فلم کا سکرپٹ تو بن سکتا ہے۔ امریکہ میں اس کا شائع ہونا ممکن نہیں"۔

عذرا اس دوران مین ہٹن کے ایک ہوٹل میں "میڈ" کے طور پر کام کرنا شروع کر چکی تھی۔ وہی کام جو ہمارے یہاں گھر میں کام کرنے والی ماسی کیا کرتی ہے۔ میرا سمسٹر ختم ہونے والا تھا میں نے اپنا گریڈ بہتر کرنے کے لیے تعلیم پر بھی زیادہ توجہ دینا تھی، زندگی کی ساری رومانویت نیویارک کی مشینی زندگی کی زد میں آ کر تہس نہس ہو چکی تھی۔ اس لیے میں کافی حد تک قنوطیت کا شکار ہو چکا تھا۔ اور مردم بیزار بن چکا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ ہوتے ہیں۔ جو امریکہ آ کر ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔ مجھ سے تو ایک عذرا کو معمولی سی رقم فراہم نہیں کی جا سکی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ٹیکسی چلانی چاہیے کیونکہ سردست صرف اسی ایک کام میں آمدن کا چانس زیادہ تھا اگرچہ اس کام میں مار پیٹ ہونے کا خطرہ ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ لیکن حادثہ تو زندگی میں کہیں بھی پیش آ سکتا ہے۔ ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تو مجھے گل خان یاد آیا میں نے اسے فون کیا "بھائی آپ تو ہم کو بالکل بھول گیا تھا"۔ اس نے دعا سلام کے بعد کہا میں نے اس سے ملنے کی فرمائش کی ٹھیک چالیس منٹ بعد وہ میرے پاس پہنچ چکا تھا۔

میں نے اسے بتایا "مجھے اس وقت کچھ رقم کی ضرورت ہے" وہ اس بات کا مطلب کچھ اور سمجھا۔ "آپ ہمارا بھائی ہے آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ کتنا رقم چاہیے؟" اس نے دریافت کیا میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وضاحت کی کہ میں پارٹ ٹائم کے طور پر ٹیکسی چلانا چاہتا ہوں وہ اس کے حق میں نہیں تھا تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد اس نے کہا ہم بابا جی کے پاس چلتا ہے وہ جو بھی مشورہ دے گا ہم وہ ہی کرے گا۔ بحث سے بچنے کے لیے میں نے اس کی شرط مان لی راستے میں مجھے بدھ راہب کی بات یاد آئی جس میں اس نے یہ اشارہ دیا تھا کہ تم کسی بڑے گیانی سے مل چکے ہو حاجی نزاکت اپنے اسی مخصوص حلیے میں تھے۔ اس مرتبہ ان کے کہنے پر گل خان الماری میں سے پلیٹ نکال کر لایا تو اس میں چنے کی دال والے چاول تھے میں نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو ان کا ذائقہ میٹھا تھا حاجی صاحب نے وضاحت کی "آج شیخ الاسلام فریدالدین مسعود گنج شکر کا عرس ہے اور یہ ان کی نیاز کے چاول ہیں" میرے ذہن میں بدھ راہب کی باتیں گونج رہی تھی میں نے ان سے دریافت کیا "معرفت کیا چیز ہے؟" انہوں نے جواب دیا "معرفت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لے" میں نے انہیں بتایا ایک بدھ راہب سے میری ملاقات ہوئی تھی میں نے اس راہب کے ساتھ ہونے والے مکالمے کے بارے میں انہیں تفصیلاً بتایا اور دریافت کیا اس راہب کو جو گیان حاصل ہے۔ کیا ہم اسے معرفت کہہ سکتے ہیں؟ حاجی صاحب میری بات پر مسکرائے اور بولے برصغیر علم تصوف کے بارے میں سب سے پہلی لکھی جانے والی کتاب "کشف المحجوب" ہے جو حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف ہے اس میں انہوں نے نے ایک یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے وہ خدا کی معرفت کے لیے حجاب

کی حیثیت رکھتی ہے۔ داتا صاحب کے بیان کردہ اسی اصول کے پیش نظر ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے جوگی، بدھ راہب، سادھو، سنت اپنی ذات سے صادر ہونے والے دو چار کرتبوں کو معرفت یعنی گیان سمجھ لیتے ہیں لیکن جوگیان آپ کو خدا کے بارے میں واضح تصور نہیں دے سکتا اس نے اور کیا کام آنا ہے۔ حاجی صاحب کے اس جواب پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں کو خدا کی صحیح معرفت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیا میں کم تر حیثیت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ میں نے یہی سوال ان سے کر دیا۔ تو انہوں نے وضاحت کی دو چیزیں ہیں ایک خدا کا حکم اور دوسرا اس کی مشیت خدا کا حکم یہ ہے کہ ہم مسلمان ہوں اور اس کی مشیت یہ ہے کہ دنیا میں بعض حوالوں سے ہمیں اہل دنیا کی نظر میں کم تر سمجھا جائے۔ میں نے پھر ان سے اختلاف کیا ''سوال یہ ہے کہ جب ہم خدا کے صحیح اور سچے ماننے والے ہیں تو پھر دنیا میں ہمیں عروج کیوں نصیب نہ ہو؟'' میں نے اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی کی کہ میں خدا کے فیصلے کو بالکل درست سمجھتا ہوں لیکن منطقی انداز میں اپنی تشفی کے لیے یہ سوال کر رہا ہوں ''عقل کا دائرہ کار محدود ہے جبکہ خدا کی حکمت کی کوئی انتہا نہیں ہے اگر انسان اپنی پیمائش کرلے تو اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ تمام جہانوں کے پروردگار کے فیصلے کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے'' میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے جواب دینے سے پہلوتہی کی ہے لیکن لمحہ بھر میں میرے سامنے روشن ہوا کہ انہوں نے خالص فلسفیانہ انداز میں منطقی اصولوں کے مطابق قانونی رائے دی ہے میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا آپ کی ظاہر حالت ایسی کیوں ہے؟ میرے اس سوال پر گل خان کی آنکھیں چمکیں کیونکہ ایک سادہ لوح معتقد ہونے کے ناطے وہ حاجی صاحب سے یہ سوال نہیں کر سکتا تھا۔ بس بابا یہ اللہ کا حکم ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر پہلوتہی کی لیکن اس مرتبہ میں نے کچھ جرات کی اللہ تعالٰی نے تو اپنے نبی پر کوئی ایسا حکم نازل نہیں کیا؟ وہ میری بات پر مسکرائے یوں جیسے میں نے کوئی بچگانہ سوال کیا ہو بابا بارک اوبامہ اللہ کے حکم سے امریکہ کا صدر بنا ہے۔ یا اس کے حکم کے بغیر؟ گل خان نے داد دینے کے انداز میں ان کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا میں نے ان کے جواب سے کوئی اثر لیے بغیر دریافت کیا کیا آپ خود کو امریکی صدر کے ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ میری اس بات پر انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ بابا جو کچھ مجھے حاصل ہے اگر وہ ایک لمحے کے لیے امریکی صدر کو حاصل ہو جائے تو وہ اس ایک لمحے میں عوض میں اپنا جاہ و منصب قربان کر دے اور میری یہ حالت ہے کہ اگر مجھے یہ کہا جائے کہ اگر میں ایک لمحے کے لیے اس نعمت سے دست بردار ہو جاؤں تو قیامت قائم ہونے تک ساری دنیا کی حکومت مجھے مل جائے گی تو میں پھر بھی لمحہ بھر کے لیے بھی اس نعمت سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرونگا۔ حاجی صاحب نے پر جلال لہجے میں اپنی بات مکمل کی تو میں کچھ خوف زدہ ہو گیا خاصی دیر ہم خاموش رہے پھر میں نے گل خان کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی آمد کا اصل مدعا بیان کرے گل خان نے انہیں بتایا کہ میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم ٹیکسی چلانا چاہتا ہوں تو حاجی صاحب بولے لیکن ٹیکسی چلاتے ہوئے تو کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ میں نے لاپروائی سے جواب دیا حادثہ تو کہیں بھی پیش آ سکتا ہے۔ انہیں

شاید میرا انداز پسند نہیں آیا لیکن انسان کو کبھی کوئی ایسا حادثہ بھی پیش آ جاتا ہے۔ جو زیادہ نقصان دہ ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس وقت مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔ میرے اصرار پر حاجی صاحب نے مجھے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کے ساتھ ٹیکسی چلانے کی اجازت دے دی اور گل خان کو یہ ہدایت دی کہ وہ اس بارے میں ہر ممکن حد تک میری مدد کرے۔

اگلے چند دن میں گل خان نے میرے لیے ٹیکسی کا بندوبست کر دیا جو پانچ گھنٹے تک میرے پاس رہتی تھی۔ اور اس کا میں نے روزانہ طے شدہ معاوضہ ادا کرنا تھا میں اس سے زیادہ وقت دینا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میری اپنی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ پی ایچ ڈی سکالرز کو اسسٹ کرنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی جسے درمیان میں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ امریکی تعلیمی نظام کو اس طریقے سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اگر آپ وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں تو ایک خوشحال مستقبل آپ کا منتظر ہوتا ہے۔ اور اگر آپ درمیان میں ہمت ہار جاتے ہیں تو پھر آپ کا شمار نہ تین میں کیا جا سکتا ہے نہ تیرہ میں لیکن ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ اپنے روشن مستقبل کے عوض آپ کی خواہشات بھی پوری جاتی ہیں۔ لیکن بہت سی خواہشات تشنہ تکمیل بھی رہ جاتی ہیں۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام ایک مہاجن کی طرح آپ کو دی جانے والی آسائش کے معاوضے کی اصل رقم سود سمیت واپس لیتا ہے۔ ایک جونک کی طرح آپ کی رگوں میں سے خون کا ہر قطرہ چوس لیتا ہے۔ آپ کو ایک خوابناک خوابگاہ تو نصیب ہو جاتی ہے۔ لیکن جس قدر محنت کے بعد ملتی ہے۔ اتنی محنت کے بعد تو انسان کو کھردری زمین پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ لیکن لوگ اسی شکارگاہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

میرے ذاتی اخراجات پہلے ہی بہت محدود اور کم تھے اب میں نے کنجوسی کی حد تک انہیں کم کر لیا۔ ایک ہفتے کے اندر میں نے معمولی سی رقم پس انداز کی، عذرا سے ملاقات ہوئی تو میں نے وہ حقیر سا نذرانہ لفافے میں ڈال کر اس کی طرف بڑھایا یہ منگل کی ایک خوشگوار شام تھی پہلے میرا یہ ارادہ تھا کہ میں ہفتے میں سات دن ٹیکسی چلایا کروں گا لیکن گل خان نے مجھے سمجھایا ایک تو یہ کام میرے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا دوسرا میرا جسم ایسی مشقت کا عادی نہیں ہے اس لیے اگر میں سات دن مسلسل کام کرتا رہا تو بہت جلد بیمار ہو جاؤں گا۔ ''مشینوں کو بھی وقفہ کی ضرورت ہوتی ہے آدمی تو پھر آدمی ہے''۔ اس کی یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہفتہ اور اتوار کے دن کیونکہ سواریوں کا رش زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے چھٹی نہیں کی تھی میرے لیے آرام اور سکون حاصل کرنے کے لیے سب سے بہترین ذریعہ عذرا کے ساتھ وقت گذارنا تھا اس لیے میں اس ہوٹل کے باہر آ گیا تھا جہاں وہ کام کرتی تھی اب ہم ایک سستے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے عذرا نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے کو دیکھا اور دریافت کیا ''یہ کیا ہے'' مجھے جواب دینے میں دقت ہوئی جو بھی ہے تم اسے اپنے پرس میں رکھ لو مجھے ہینڈ بیگ کا لفظ سُجھائی نہیں دیا اس لیے میں نے اسے عام محاورے کے مطابق لفظ پرس استعمال کیا اور یہی میری غلطی تھی اس نے اندازہ لگا لیا کہ لفافے میں کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری ہدایت کے برخلاف اس نے اسی وقت

لفافہ کھول کے اس میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک سو ڈالر کے چند نوٹ تھے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس لیے تمہارے ساتھ نہیں آئی ہوں اس نے وہ ڈالر دوبارہ لفافے میں ڈالے اور لفافہ میری طرف بڑھا دیا وہ ایک خوددار لڑکی تھی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا ایک انا پرست لڑکی تھی یہ اس کی انا ہی تھی کہ جس کی خاطر اس نے میری محبت سے منہ موڑ کر اپنے باپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ خودسری میرے مزاج میں بھی تھی لیکن دوسروں کے لیے میں موم ہو جاتا تھا۔ میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اگر عذرا نے میرا نذرانہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میں کیا کرونگا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کا ہوٹل میں کام کرنا مجھے گراں گزرتا ہے۔ اور میری یہ خواہش ہے کہ اُس کا اور اُس کی بچیوں کا خرچ فراہم کرنے کی ذمہ داری میری ہو۔ میری بات پر وہ تڑپ اٹھی ''تم اپنے گلے میں یہ مصیبت کیوں ڈالو'' اُس نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا تو پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ یہ شکر تھا کہ ہم اردو میں بات کر رہے تھے میں نے کچھ دیر اُسے رونے دیا پھر اُسے سمجھانے کی کوشش کی تمھارے ناتے میرا ابھی اُن سے تعلق ہے اس لیے یہ میرا فرض ہے۔ اب وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''تمھارا ان سے کوئی ناطہ کوئی تعلق نہیں ہے وہ میری بیٹیاں ہیں اگر ان کا باپ ان کی پرورش نہیں کر سکتا تو پھر یہ میری ذمہ داری بنتی ہے'' اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ یقیناً تمہاری ذمہ داری ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں تمہارا ساتھ تو دے سکتا ہوں۔ اس پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا تم کہاں کہاں تک میرا ساتھ دو گے؟ میں نے فوراً کہا میں زندگی کے ہر موڑ پر ہر مشکل اور آسان گھڑی میں ہر خوشی اور ہر غمی میں ہر لحظے ہر لمحے تمہارا ساتھ دونگا۔ مجھے اپنا حلق نمکین ہوتا محسوس ہوا، میری اس بات پر اُس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ تمہیں یہی کہنا چاہیے لیکن میں تمہارے قابل نہیں ہوں اُس کا انداز شکست خوردہ تھا اسی لیے میں نے اُس کی بات کاٹی تم کیوں میرے قابل نہیں ہو؟ میں ایک شادہ شدہ عورت ہوں۔ دو بچوں کی ماں ہوں دو بیٹیوں کی ماں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں پہلے ہی تم سے بے وفائی کی مجرم ہوں۔ اپنے پر قابو رکھنا شاید اُس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لیے وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی میں نے اٹھنے کے لیے کرسی کھسکائی لیکن اُس نے ہاتھ کے اشارے کے ذریعے مجھے اپنے ساتھ آنے سے منع کر دیا اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی۔

اپنے ہاسٹل واپس آ کر میں نے ساری رات جاگ کر گزاری۔ ماضی کی بہت سی یادیں ذہن کے دروازوں پر دستک دیتی رہیں۔ طبیعت آمادہ نہ ہونے کے باوجود میں اگلے دن یونیورسٹی آ گیا۔ جولیا سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا آج پینسولینیا یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی علوم سے تعلق رکھنے والے ایک محقق کا وزیٹنگ لیکچر ہے' میری طبیعت آمادہ نہیں تھی لیکن جولیا کی خواہش کے احترام میں مجھے جانا پڑا' لیکچر کے آغاز سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ نام نہاد محقق ایک متعصب شخص ہے' اس نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہی ایسی باتیں کیں کہ مجھے محسوس ہوا میں اپنے شہر کی کسی چھوٹی سی مسجد میں فرقہ ورانہ اختلافات کے موضوع پر کسی انتہا پسند مقرر کی تقریر سن رہا ہوں' اس کی باتوں میں دلیل سے زیادہ جذباتیت کا رنگ تھا۔

امریکی معاشرے میں آزادی اظہار رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی آزادی کی آڑ میں بعض بدباطن اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں منفی پراپیگنڈہ کرتے ہیں وہ بھی ایک ایسا ہی شخص تھا لیکن کیونکہ وہ ایک یونیورسٹی کا پروفیسر تھا اس لئے اس کی کہی ہوئی بات تحقیق کے مطابق سمجھی جا رہی تھی اور کوئی شخص اس تحقیق پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا' اس کا لیکچر ختم ہونے پر سوالات کا سلسلہ شروع ہوا' تو ایک کونے سے سوال آیا' ''اگر پیغمبر اسلام کی تعلیمات دہشتگردی کے فروغ کا باعث ہیں تو اسلام کو الہامی مذہب کیوں کہا جاتا ہے؟''۔ اس کے جواب میں پروفیسر نے یہ وضاحت کی کہ ''اسلام کے ماننے والے اس بات کے دعویدار ہیں کہ ان کا مذہب الہامی ہے ورنہ تحقیق اور دلائل و شواہد کے اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے''۔ اس پر فوراً ایک اور شخص کھڑا ہو گیا ''اگر اسلام الہامی مذہب نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی الہامی کتاب اپنی اصل شکل و صورت میں من و عن موجود ہے جبکہ دیگر الہامی کتابوں میں بہت زیادہ لفظی اختلاف پایا جاتا ہے''۔ اس کے جواب میں پروفیسر نے یہ توجیہہ پیش کی ''پیغمبر اسلام انتہائی تجربہ کار اور سمجھدار شخص تھے انہوں نے اپنے زمانے کی ایک بڑی عیسائی ریاست شام کے سفر کے دوران یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ انجیل مقدس کے نسخوں میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اسی لیے جب انہوں نے اپنی کتاب یعنی قرآن کو مرتب کیا تو اپنے ماننے والوں کو بطور خاص اس بات کی تاکید کی کہ ان کی کتاب کو بڑی احتیاط کے ساتھ آگے نقل کیا جائے'' اس کی یہ توجیہہ بظاہر قابل قبول نظر آتی تھی' لیکن سوال کرنے والے کو کون روک سکتا ہے؟ ایک شخص نے سوال اٹھایا: الہامی کتاب کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے' جو خیال پیغمبر اسلام کو اپنی کتاب کے بارے میں آیا وہ خیال خدا اور مسیح کو کیوں نہیں آیا؟ اور بالفرض اگر نہیں بھی آیا' تو خدا نے ایک ایسی کتاب کو دنیا میں کیوں باقی رہنے دیا' جس کی نسبت خدا کی طرف آپ کے بقول غلط طور پر کی جاتی ہے اس سوال کا پروفیسر کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا اس لیے وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا' ایک شخص نے اٹھ کر یہ سوال کیا'' آپ کے بقول اگر اسلام الہامی مذہب نہیں ہے تو ویٹی کن میں بیٹھا ہوا ''پوپ'' اس بات کا اعلان

کیوں نہیں کرتا......؟''۔اس کے جواب میں پروفیسر نے یہ توجیہہ پیش کی کہ بین الاقوامی حالات کی وجہ سے اس بات کے اعتراف سے گریز کیا جاتا ہے کیونکہ ایسا کرنے کے نتیجے میں مسلمانوں کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آنے کا اندیشہ ہے'اسی طرح کے بعض دیگر سوالات کیے گئے جن کے جوابات سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہورہی تھی کہ پروفیسر بنیادی طور پر ایک متعصب انتہاپسند اسلام دشمن شخص ہے'اس لیے مجھے اس کی باتوں پر شدید غصہ آرہا تھا' سامعین میں موجود دیگر مسلمانوں کے جذبات بھی کچھ اسی طرح کے ہوں گے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی جولیا کھڑی ہوئی''اس بات کا کس حد تک امکان موجود ہے کہ آپ کی تحقیق اور بیان غلط بھی ہوسکتے ہیں؟''اس نوعیت کے سوال کی توقع کسی کو بھی نہیں ہوگی پروفیسر تیز لہجے میں بولا:''میں پینسولینیا یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں'اسلام میں شدت پسندی کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرچکا ہوں تو میری تحقیق کیسے غلط ہوسکتی ہے؟''جولیا پھر کھڑی ہوگئی''ٹھیک یا غلط ہونے کا تعلق کسی ادارے یا عہدے سے نہیں ہوتا'پیغمبر اسلام کے پیروکار پوری دنیا میں ایک ارب ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہیں'جن میں سے پچاس لاکھ سے زیادہ مسلمان امریکہ میں بستے ہیں'اتنی بڑی تعداد کے مذہبی پیشوا کو کیا ہم محض اس لیے غلط تسلیم کرلیں کہ اس مذہبی پیشوا نے کسی امریکی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی نہیں کی یا وہ کسی امریکی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر نہیں رہے؟''جولیا کے اس سوال پر ہال میں موجود بعض افراد نے تالیاں بجائیں جبکہ پروفیسر نے اس پر صرف یہ تبصرہ کیا کہ یہ کوئی سوال نہیں ہے'مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا میں نے یہ کہا کہ میں مائیک کے سامنے آکر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔پروفیسر نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اس کی اجازت دی۔مائیک کے سامنے آکر میں نے ایک نگاہ حاضرین پر ڈالی اور اپنی بات کا آغاز کیا''میرا نام رضا ہے دنیا کے نقشے پر میرا ملک پاکستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔تاہم تاریخی طور پر یہ ایشیا کا وہ حصہ ہے جس کا نام انڈیا تھا یہ وہی انڈیا ہے جس کی تلاش میں کرسٹوفر کولمبس سپین سے روانہ ہوا اور امریکہ پہنچ گیا اسی وجہ سے یہاں کے قدیم باشندوں کو ریڈ انڈین کہا جاتا ہے۔میرا تعلق جس نسل سے ہے وہ خود کو بنی نوع انسان کی سب سے افضل اور بہتر نسل سمجھتے ہیں۔ ہمارے آباؤاجداد ہندومت کے پیروکار تھے اور ہندومت کے نزدیک مسلمان کا جوتا بھی ناقابل استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں آج بھی ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں۔محترم پروفیسر جو پینسولینیا یونیورسٹی جیسے بڑے ادارے سے وابستہ ہیں وہ مجھ سمیت تمام حاضرین کے نزدیک قابل احترام ہیں''۔میں نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا ورنہ میرا اسے گالیاں دینے کو جی چاہ رہا تھا۔''انہوں نے اپنی ریسرچ کے دوران یقیناً مختلف پہلوؤں سے اسلام کا مطالعہ کیا ہوگا۔میرا مطالعہ ان کی طرح وسیع نہیں ہوگا لیکن کیونکہ میرے آباؤاجداد اسلام کے بدترین مخالف تھے اور میں خود اسلام کا ایک ادنیٰ سا پیروکار ہوں اس لیے میں اسلام کے کچھ پہلوؤں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔اسلام کی بنیادی تعلیمات یہ ہیں کہ خدا ایک ہے وہ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے ایک ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔حضرت محمدؐ'حضرت موسیٰ'حضرت ابراہیم'حضرت مسیح اور دیگر تمام نبی خدا کے بندے اور اس کے

رسول ہیں۔ حضرت مسیح اور ان کی والدہ بی بی مریم بنی نوع انسان کے دو فرد تھے اور کوئی بھی انسان بلکہ کوئی بھی مخلوق خدا کی اولاد نہیں بن سکتی' تاہم حضرت مسیح اور ان کی والدہ خدا کی بارگاہ میں برگزیدہ ترین حیثیت کے مالک ہیں۔ اسلام عیسائیت اور یہودیت سمیت دنیا کے تمام مذاہب کا احترام کرتا ہے' اگر یہ کہا جائے کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا تو آج دنیا میں ایک ارب ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ مسلمان رہتے ہیں ان میں سے اکثر تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ان کی گردن پر تو کسی نے تلوار نہیں رکھی ہوئی وہ کیوں مسلمان ہیں؟ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان دہشتگرد ہوتے ہیں تو اس وقت امریکہ میں پچاس لاکھ سے زائد مسلمان رہتے ہیں ان میں سے کتنے لوگ دہشتگرد ہیں۔ اس لیے میری یہ گزارش ہے کہ آپ مثبت انداز میں اسلام کا مطالعہ کریں''۔ میں نے اپنی بات مکمل کی اور ڈائس سے اتر کر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پروفیسر نے میرے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم ہال سے باہر نکلے تو بعض افراد نے آگے بڑھ کر میرے ساتھ پرجوش معانقہ کیا۔

ہم دونوں کینٹین میں آ کر بیٹھ گئے تو جولیا نے مجھے داد دیتے ہوئے کہا: ''تم ایک اچھے سپیکر ہو'' میں نے بے چارگی سے جواب دیا: ''میرے اچھے سپیکر ہونے کا کیا فائدہ جب کوئی میری بات سننے پر ہی آمادہ نہیں'' میرے ذہن میں گذشتہ شام عذرا سے ہونے والی ملاقات تھی لیکن اُسے اس بارے میں پتہ نہیں تھا ''کیوں کیا ہوا؟ کون تمہاری بات نہیں سننا چاہتا؟'' میں نے عذرا کے ساتھ ہونے والی گذشتہ ملاقات کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا ''اس کا مطلب ہے وہ خود اذیتی کا شکار ہے اور تمہارے ساتھ اُس نے جو زیادتی کی ہے اُس کی سزا خود کو دینا چاہتی ہے'' جولیا کا یہ تجزیہ درست تھا ''لیکن وہ اِس غلطی کی سزا خود کو نہیں بلکہ مجھے دے رہی ہے'' اب میں اُسے کیا بتاتا کہ عذرا سرے سے میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی ''پہلے اُس نے اپنے والد کی ناراضگی کو جواز بنایا تھا اور اب وہ اپنی بیٹیوں کی خاطر مجھے قبول کرنے سے انکاری ہے''۔

''تمہارے ہاں مشرق میں لوگ اسی طرح دوسروں کے جذبات سے کھیلتے ہیں؟'' جولیا جس معاشرے کی لڑکی تھی وہاں اسی طرح صاف اور دوٹوک بات کی جاتی ہے ''دراصل یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے'' میں نے عذرا کے مؤقف کا دفاع کرنے کی کوشش کی ''دوسروں کے جذبات سے کھیلنا؟'' اُس نے حیرانگی سے دریافت کیا ''نہیں! باپ اور بھائیوں کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دینے کی اور اولاد کی خاطر قربانی دینے کی'' میں نے وضاحت کی تو اُس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا: ''محبت کرنے والے شخص کی قربانی دینے کی؟'' ہم یہی بات کر رہے تھے کہ اسی دوران سفیان بن قیس وہاں آ گیا' یہ وہی شخص تھا جس کے ساتھ چند دن پہلے امام مسجد کی گرفتاری کے حوالے سے ملاقات ہوئی تھی' اُس کے ساتھ دو دیگر افراد بھی تھے' اُن تینوں نے میرے ساتھ پُرجوش مصافحہ کیا بلکہ ایک نے تو آگے ہو کر میرے گال پر بوسہ بھی دیا' وہ شاید کوئی عرب تھا ''میرے بھائی آج تم نے مسلمان ہونے کا حق ادا کر دیا'' سفیان نے بیٹھتے ہی کہا تو میں اُس کی

جذباتیت پر مسکرا دیا ”مسلمان ہونے کا حق ادا کرنا اتنا آسان نہیں ہے“ میری بات پر اُس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی ”میرا یہ مطلب نہیں تھا میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اُس وقت ایک مسلمان کے طور پر ہم سب کا یہ فرض تھا کہ ہم اُس متعصب اور جاہل پروفیسر کو جواب دیتے اور یہ فرض تم نے ادا کیا ہے“ وہ یمن کا رہنے والا تھا‘ اُس کے ساتھ آنے والے افراد بھی شاید عرب ہی تھے‘ عربوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ سعودی عرب سے لے کر مراکش تک کسی بھی عرب ملک میں اظہارِ رائے کی آزادی نہیں ہے‘ اس لیے وہ لوگ جب ایک گھٹن زدہ معاشرے سے مغرب کے آزاد معاشرے میں آتے ہیں تو اظہارِ رائے کی تمام تر آزادی ہونے کے باوجود اپنے سابقہ خول سے باہر نہیں نکل پاتے اور اگر کبھی کوئی مجھ جیسا سرپھرا شخص آواز بلند کر لے تو اُسے فوراً ”مجاہد“ کا خطاب دے دیتے ہیں‘ عالمِ اسلام کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک مخصوص گروپ اپنے مخصوص علاقائی اور مالی مفادات کے لیے کلاشنکوف بردار مجاہد بنتے ہیں‘ ان کے علاوہ باقی سب مسلمان ”خاموش مجاہد“ ہوتے ہیں‘ ان میں کوئی بھی ”بولنے والا مجاہد“ نہیں ہے‘ ان سب سے زیادہ دلیر تو ہیوگوشاویز ہے‘ جو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں دنیا بھر کے سربراہانِ حکومت کے سامنے کھل کر امریکہ اور اُس کے اتحادیوں پر تنقید کرتا ہے‘ میں نے سفیان اور اُس کے دیگر ساتھیوں کا دل رکھنے کے لیے یہ سب باتیں اُن سے نہیں کیں وہ اگر اسی میں خوش تھے تو میں اُنہیں افسردہ کیوں کرتا ”وہ بدبخت اور بدباطن جاہل پروفیسر بہت ہی بدتمیز اور گستاخ شخص تھا ایسے لوگوں کو امریکہ میں محقق اور دانشور سمجھا جاتا ہے تم دیکھ لینا اُس کا انجام بہت بُرا ہوگا“ سفیان کے ایک ساتھی نے جلے بُھنے لہجے میں کہا‘ یہ وہی شخص تھا جس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے میرے گال پر بوسہ دیا تھا‘ اپنے طرزِ عمل سے وہ ایک جذباتی شخص محسوس ہو رہا تھا‘ ویسے مسلمانوں کی اکثریت صرف جذباتی ردِعمل ظاہر کرنے پر اکتفاء کرتی ہے اور یہی سوچ کر خود کو تسلی دے لیتی ہے‘ امریکہ کا انجام بہت بُرا ہوگا فلاں شخص کا انجام بہت بُرا ہوگا‘ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ”ہم نے بچپن میں سکول کی کتاب میں یہ بات پڑھی تھی کہ مکہ میں ایک عورت تھی جو روزانہ ہمارے پیارے نبیؐ پر کوڑا اچھینکا کرتی تھی‘ آج زمانہ تبدیل ہوگیا ہے‘ اسلام کے بارے میں تعصب پر مبنی بیانات‘ لٹریچر وغیرہ پھیلانا اُسی کوڑا اچھینکنے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے‘ ہم مسلمانوں کو تو یہ پتہ ہے کہ یہ سب کوڑا کرکٹ ہے اب ہم نے دوسروں کو یہ سمجھانا ہے کہ یہ سب کوڑا کرکٹ اور گندگی ہے“ میری اس بات پر سفیان نے تعریفی انداز میں یہ کہا: ”تم نے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے“ میں نے اُنہیں سمجھایا جس وقت نبی اکرم ﷺ نے اعلانِ نبوت کیا تھا‘ اُس وقت آپ کا انکار کیا گیا لیکن نبی اکرم ﷺ نے کفار کی طرف سے دیئے جانے والے گستاخانہ القابات کے باوجود دعوتِ حق دینے کے سلسلے کو موقوف نہیں کیا‘ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کا انکار کرنے والے بلکہ آپ کے ساتھ جنگ کرنے والے بہت سے لوگ آپ کے حلقہ بگوش ہو گئے‘ اس لیے ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم امریکہ سمیت دنیا کی تمام اقوام اور تمام ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد تک اسلام کی صحیح دعوت پہنچائیں‘ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکیوں کی بہت سی پالیسیاں اُمتِ مسلمہ کے لیے نقصان دِہ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب

ہرگز نہیں ہے آپ انٹرنیٹ پہ آ کر یہ اعلان کریں کہ دنیا بھر میں موجود امریکی تنصیبات کو نقصان پہنچائیں گے۔ وہی پُرجوش شخص بولا: ''میرے برادر یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے دشمن ہیں یہ کبھی ہمارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے'' میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی یہودی اور عیسائی ہمارے دشمن ہیں اور ہم اُنہیں اپنا دشمن ہی سمجھتے ہیں لیکن دشمنی کے اظہار کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ کوئی بھی شخص کسی بھی ملک کے عام شہریوں کو نقصان پہنچائے' اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں' کچھ دیر بعد وہ لوگ رخصت ہونے لگے تو میں نے کھڑے ہو کر جولیا کی تلاش میں ایک نظر کینٹین پر دوڑائی جو سفیان وغیرہ کے آنے پر معذرت کر کے اُٹھ کر چلی گئی تھی' وہ کینٹین کے ایک کونے میں اکیلی بیٹھی تھی میں اُٹھ کر اُس کے پاس آ گیا'' تمہارے دوست رخصت ہو گئے'' میرے بیٹھتے ہی اُس نے دریافت کیا تو میں نے وضاحت کی: ''وہ میرے دوست نہیں تھے بلکہ میرے مائیک کے سامنے آ کر بات کرنے پر مجھے مبارکباد دینے آئے تھے'' اُس نے میری وضاحت کے جواب میں کوئی بات نہیں کی' کچھ دیر بعد اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا: ''مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اپنی عملی زندگی میں مسلمان دوغلی پالیسی کیوں اختیار کرتے ہیں'' میں نے اُسے اپنی بات کی وضاحت کرنے کے لیے کہا تو وہ بولی: ''جس بھی مسلمان سے بات کرو وہ اپنے مذہب کا پُرجوش سپاہی محسوس ہوتا ہے لیکن اُس کا سارا جوش میز کے ایک سرے پر بیٹھ کر کافی پینے تک ہوتا ہے' عملی زندگی میں' میں یہ نہیں کہتی کہ سارے مسلمان' تاہم اکثر مسلمان جھوٹے اور دھوکے باز ہوتے ہیں'' اُس کے الفاظ خاصے سخت تھے ''تمہیں کس مسلمان نے دھوکا دیا ہے؟'' میں نے بات کو مذاق کا رنگ دینے کی کوشش کی'' میں کسی ایک فرد کی بات نہیں کر رہی امریکی معاشرے میں مسلمانوں کے بارے میں یہ تاثر عام ہے'' پہلے میرے جی میں آئی' میں اُسے یہ کہوں کہ یہ تمہاری خام خیالی ہے' لیکن پھر میں نے یہ سوچا' اگر اُس کی بات کو درست فرض کر لیا جائے تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بات کا سرا میرے ہاتھ میں آ گیا۔'' اصل مسئلہ یہ ہے کہ امریکیوں کے معاشرتی نظام اور مسلمانوں کی معاشرت میں بہت فرق پایا جاتا ہے' مغربی معاشرہ بچے کو آزادی دیتا ہے جبکہ مشرقی معاشرہ' میں صرف مسلمانوں کی بات نہیں کر رہا بلکہ جاپان جیسے دو ایک ممالک کو چھوڑ کر مشرق کے اکثریتی حصے میں بچوں کو بے مہار آزادی نہیں دی جاتی' جبکہ مغربی معاشرے میں بچوں پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہوتی' اس لیے وہ اپنی کسی بھی غلطی کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے' اپنی کسی خامی پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے' اس کے برعکس مشرق میں معاشرتی روایات کے نام پر صرف بچوں پر ہی نہیں بڑوں پر بھی بہت سی پابندیاں لگائی جاتی ہیں اُن سے بہت سی توقعات وابستہ رکھی جاتی ہیں'' میں نے اُسے مثال دیتے ہوئے کہا کہ عذرا ایک عاقل' بالغ' تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کے باوجود اپنے باپ کے سامنے یہ اعتراف نہیں کر سکتی تھی کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنے کی خواہش مند ہے'' یہ تو ایک بہت بڑا فیصلہ تھا' زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بچوں پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں' اب کوئی شخص تمام توقعات پر پورا نہیں اُتر سکتا' کہیں نہ کہیں اُس سے خلاف ورزی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے گھر اور اپنے معاشرے کے ردِعمل کے خوف سے

جھوٹ بولتا ہے' وقت گزرنے کے ساتھ اُس کی یہ عادت پختہ ہوتی چلی جاتی ہے' وہ یہی سمجھتا ہے کہ اُس کا جھوٹ بے ضرر ہے' اس لیے جب مغربی معاشرے میں اُسے اس نوعیت کی کسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ کنفیوز ہو کر اپنا وہی پرانا نسخہ آزمانے کی کوشش کرتا ہے'' میں نے وضاحت کی: ''یہ اجتماعی رویے ہیں جنہیں یکسر تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں اور امریکیوں کے درمیان موجود خلیج بھی اس تاثر کی ایک اہم وجہ ہے''۔

میرا ٹیکسی چلانے کا ٹائم ہو رہا تھا' اس لیے میں نے جولیا سے اجازت لی' اگرچہ گذشتہ رات جاگنے کی وجہ سے میرا ذہن اور جسم اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ میں کام پہ جاؤں لیکن مغربی معاشرے کی یہ ایک بڑی خوبی ہے اور ہم جیسے کاہل الوجود مشرقی افراد کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ کوئی بھی مزدور اپنے کام سے ناغہ نہیں کر سکتا اگر وہ ناغہ کر لے تو نوکری سے جواب مل جاتا ہے۔ دو ایک سواریوں کو اُن کی منزل تک پہنچانے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر اس ہوٹل کے سامنے آ گیا جہاں عذرا کام کر رہی تھی' اُس کی چھٹی کا وقت ہونے والا تھا' میں اُس کے ساتھ وقت نہیں گزار سکتا تھا' صرف یہ ہو سکتا تھا کہ اُسے اُس کے گھر تک پہنچا دیتا' یوں وہ لوکل ٹرین میں دھکے کھانے سے بچ جاتی اور میرا کچھ وقت اُس کے وقت گزر جاتا۔ چھٹی کا وقت ہونے کے کچھ دیر بعد عذرا باہر آئی تو میں تیزی سے دروازہ کھول کے نیچے اُترا اور آواز دے کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا' وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی' اُس کے چہرے پہ تھکن کے آثار تھے' راستے میں میں نے اُس سے کہا: ''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟'' ''کس بارے میں؟'' اُس نے تجاہلِ عارفانہ سے دریافت کیا'' میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارا اس طرح سے کام کرنا مجھے پسند نہیں ہے'' میں نے اپنی کل کی بات دُہرائی تو وہ بولی: ''اس میں حرج کیا ہے امریکہ میں سبھی عورتیں کام کرتی ہیں اور میں نے کون سا ابھی کام کرنا شروع کیا ہے کئی سالوں سے کرتی آ رہی ہوں'' اُس نے عام سے لہجے میں کہا' اس کا مطلب تھا کہ وہ گذشتہ شام کی جذباتیت پر قابو پا کر حتمی نتیجے تک پہنچ چکی تھی' ''تم پہلے کیا کرتی رہی ہو میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے' میں یہ جانتا ہوں کہ اب تم نے کام نہیں کرنا' تم اپنے شوہر سے الگ ہو کر نیویارک میں رہ رہی ہو' پاکستان میں تمہاری فیملی تک یہ بات پہنچ چکی ہو گی تمہیں بھی پتہ ہے آگے چل کر تمہارے شوہر کے ٹھیک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے' اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اُس سے طلاق لو' ہم پاکستان واپس چلے جائیں گے اور آرام سے وہاں رہیں گے' یہ تمہارے اور تمہاری بیٹیوں کے لیے بہت ضروری ہے'' میں نے ایک لمحے کے لیے ونڈ سکرین سے نظر ہٹا کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس کا چہرہ سپاٹ تھا' ''میرا خیال ہے تم غلط لائن پر سوچ رہے ہو' ہم شاید ایک دوسرے کا نصیب نہیں ہیں ورنہ پہلے ایک ہو جاتے' میں یہ نہیں کہتی کہ تم میری بیٹیوں کو باپ کا پیار نہیں دے سکو گے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ شاید وہ ذہنی طور پر تمہیں قبول نہیں کر سکیں گے' اگر وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرتی ہیں تو اس کا دُکھ بھی تو مجھے ہی ہو گا'' مجھے اندازہ تھا کہ اسے قائل کرنا اتنا آسان نہیں ہو گا' جب وہ ایک الھڑ ندی تھی' جوانی کا جوش و جذبہ بھی تھا' اس وقت بھی میں اسے قائل نہیں کر سکا تھا اب تو وہ ایک پُرسکون جھیل

تھی، جس میں کنکر پھینکنے سے اس کے پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے' کچھ لہریں بنتی ہیں اور بن کے ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر اس میں تلاطم پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

دل بھی پاگل ہے اسی شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے' نہ اپنا رکھے

اسی دوران اُس کا گھر آ گیا' اُس نے مجھے اندر چلنے کی دعوت دی لیکن میں نے معذرت کر لی' اگلے دو گھنٹے ٹیکسی چلانے میں گزر گئے مجھے مسلسل جاگتے ہوئے چالیس گھنٹے گزر رہے چکے تھے' اس لیے ذہن پر غنودگی سی چھائی ہوئی تھی' جان ایف کینیڈی ایئر پورٹ سے ایک سواری کو اُس کے مطلوبہ ہوٹل تک پہنچانے کے بعد ایک چوراہے سے موڑ کاٹتے ہوئے مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میری آنکھ لگ گئی ہے' ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز میرے کان تک آئی' لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا اور میرا ذہن مکمل طور پر غافل ہو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ہسپتال کے بیڈ پر موجود پایا۔ مجھے اپنے حواس درست کرنے میں کچھ وقت لگا' میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر نے بتایا' میری ٹیکسی ایک گاڑی سے ٹکرا گئی تھی اور ریسکیو کا عملہ بیہوشی کی حالت میں مجھے اٹھا کر لایا تھا۔ ڈاکٹر کے بقول مجھے کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی لیکن یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ میں دو گھنٹے بیہوش رہا تھا' مجھے یاد آیا کہ میں نے غنودگی کے عالم میں کسی دھماکے کی ہلکی سی آواز سنی تھی۔ ڈاکٹر نے مزید کچھ دیر مجھے زیرنگہداشت رکھنے کے بعد جانے کی اجازت دیدی۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلا تو ایک عمر رسیدہ شخص اندر آ گیا۔ اس نے پولیس کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ حادثے کے بارے میں میرا بیان نوٹ کرنے کے بعد اس نے مجھے چند لمحے انتظار کرنے کے لئے کہا اور باہر نکل گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے مجھے پولیس تفتیش کا سامنا کرنا ہوگا' کچھ دیر بعد اسی پولیس والے کے ہمراہ سادہ کپڑوں میں ملبوس دو افراد اندر آئے' انہوں نے مجھ سے میرا تعارف دریافت کیا' امریکہ میں قیام کی مدت' معاشی و معاشرتی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھا' حادثے کے بارے میں ان کے دریافت کرنے پر میں نے انہیں بتایا' ایک ذہنی پریشانی کی وجہ سے میں گزشتہ رات سو نہیں سکا تھا۔ پھر آج کا سارا دن بھی جاگتے ہوئے گزر گیا' اسی وجہ سے حادثے سے کچھ پہلے میری آنکھ لگ گئی اور اسی غنودگی کے دوران کسی دھماکے کی ہلکی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ صورتحال کے بارے میں کسی بھی قسم کا اندازہ لگانے سے پہلے ہی میرا ذہن مکمل طور پر غافل ہو گیا" "کیا تمہیں مکمل یقین ہے کہ یہ حادثہ تمہاری غفلت کی وجہ سے پیش آیا؟"۔ سادہ لباس والے شخص نے چبھتے ہوئے لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔ "ظاہر ہے کوئی بھی ذی شعور شخص جانتے بوجھتے ہوئے اپنی گاڑی کسی دوسرے کی گاڑی سے نہیں ٹکراتا' میں ایک طالبعلم ہوں اپنے اخراجات پورے کرنے کیلئے پارٹ ٹائم ٹیکسی چلاتا ہوں۔ مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ اگر میں اپنی ٹیکسی کسی درخت سے بھی ٹکرا دیتا تو میں اپنی ٹیکسی کی مرمت کا خرچ بھی افورڈ نہیں کر سکتا"۔ میں نے بھی سپاٹ لہجے میں جواب دیا' تو دوسرے شخص نے سوال کیا "کیا تم اس سے پہلے بھی کسی حادثے کے مرتکب ہو چکے ہو یا کسی اور معاملے میں کسی امریکی ایجنسی سے تمہارا واسطہ پڑ چکا ہے؟" میں نے انہیں بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے ایف بی آئی کے آفیسر انتھونی زینگر تفتیش کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے "نوجوان تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا" میں ذہنی طور پر اس بات کیلئے پہلے ہی تیار تھا۔

انہوں نے مجھے بتایا میری ٹیکسی جس کار سے ٹکرائی تھی اس کا مالک ایوان نمائندگان کا معزز رکن ہے جو اتفاق سے اس وقت اسی سٹور کے اندر موجود تھا جس کے باہر اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے میڈیا کے افراد فوراً جائے حادثہ پر پہنچ گئے اور وہ لوگ اس واقعے کو اس حوالے سے دیکھ رہے ہیں' کہیں یہ ایوان نمائندگان کے ایک معزز رکن پر قاتلانہ حملے کی کوشش تو نہیں ہے۔ ان کے ساتھ جانے کے لئے میں کمرے سے باہر نکلا تو وہاں کچھ اور افراد بھی موجود تھے۔ کچھ نے پولیس کی وردی پہنی ہوئی تھی اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ میں ان کے نرغے میں ہسپتال کی عمارت سے باہر آیا تو بہت سے کیمروں کی فلیش لائٹس چمکیں' یقیناً وہ مختلف اخبارات اور ٹی وی چینلز کے

نمائندے ہونگے، مجھے ساتھ لے جانے والے ان کے پاس آ کر ٹھہر گئے۔

''اے! کیا تم القاعدہ کے رکن ہو؟'' ایک صحافی نے سوال کیا، میں خاموش رہا، مجھے علم تھا امریکہ میں اس طرح کے رپورٹرز اپنے مخاطب کو اشتعال دلانے کے ماہر ہوتے ہیں، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے، کوئی شخص کسی ٹیڑھے سوال پر مشتعل ہو کر کوئی ایسا جواب دیدیتا ہے، جسے بعد میں بار بار نشر کر کے رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ''تم رالف لوئیس کی جان کیوں لینا چاہتے تھے؟'' ایک اور طرف سے سوال آیا۔ یہ یقیناً اس شخص کا نام ہوگا، جس کی گاڑی کے ساتھ میری ٹیکسی ٹکرائی تھی، میں نے کوئی جواب نہیں دیا، تو ایک اور شخص بولا ''تم نے یہ قاتلانہ حملہ کرنے کا کتنا معاوضہ لیا ہے؟'' لمحے بھر کیلئے میرے ذہن میں عذرا سے ملاقات کا منظر آیا، جب میں نے ایک حقیری رقم اس کی نذر کرنا چاہی تھی اور اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، میں نے چشم تصور سے عذرا کو سینک پر برتن دھوتے ہوئے دیکھا، اس کے آس پاس سینکڑوں پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں، جنہیں اس نے دھونا تھا، اس کے ساتھ ہی میرے دماغ کا ناریل چٹک گیا ''بکواس بند کرو، تم......؟'' غصے کی شدت میں مجھے سمجھ نہ آئی کہ میں کیا کہوں؟ ان میں سے ایک شخص نے تاؤ دلانے کے انداز میں پچکارتے ہوئے دریافت کیا ''تم چپ کیوں ہو گئے؟ بولو ناں'' ''ہم'' کیا؟'' اس کا انداز اچھا خاصا تضحیک آمیز تھا ''تم سب دولت کے پجاری ہو، اپنی خواہشات کے غلام ہو، تمہیں صرف اپنی غرض سے مطلب ہے، تمہیں صرف ڈالر ملنے چاہئے'' میرے جو منہ میں آیا میں کہتا گیا ''تو کیا تم نے اس قاتلانہ حملے کا معاوضہ ڈالر کی بجائے کسی اور کرنسی میں لیا تھا؟ پاؤنڈ، یورو یا پھر ریال؟'' اس کم بخت کے الفاظ کے ساتھ اس کا انداز بھی آگ لگا دینے والا تھا'' ''ڈالر تو تمہیں بھی چاہیے ہونگے، اب تم نے صرف شاباش لینے کیلئے، یا امتحان میں ''اے پلس'' گریڈ لینے کیلئے تو یہ کام نہیں کیا ہوگا'' میں نے قہر آلود نگاہوں کے ساتھ اسے گھور کر دیکھا، تو اس نے سہم جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ''اوہ ہاں! میں تو بھول ہی گیا، تم نے ''جنت'' میں جانے کیلئے یہ مقدس حملہ کیا ہوگا'' اس کی کھوپڑی میں یقیناً شیطان کا دماغ تھا، اسی وقت میرے ذہن میں خیال آیا، میرے ساتھ موجود وردی پوش اور سادہ لباس میں ملبوس پولیس والوں نے مجھے جان بوجھ کر یہاں روکا ہے، تاکہ صحافیوں کے ٹیڑھے سوالات کے جواب میں کوئی ایسی بات میرے منہ سے نکل جائے جسے بعد میں ثبوت کے طور پر استعمال کیا جا سکے، میں نے خود کو سمجھایا، میری ذرا سی جذباتیت مجھے عذرا سے بہت دور کر سکتی ہے، عذرا سے دور ہونا مجھے کسی بھی صورت میں گوارا نہیں تھا، اس لیے میں نے اپنے آپ پہ قابو پا کر نسبتاً ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''جس وقت یہ حادثہ پیش آیا تھا اس وقت میں ہوش و حواس سے بیگانہ تھا، مجھے ابھی ان پولیس اہلکاروں نے بتایا ہے کہ میری ٹیکسی ایوان نمائندگان کے ایک رکن کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی، یہ صرف ایک حادثہ ہے، اور میں امید کرتا ہوں، آپ لوگ اسے کوئی ایسا رنگ دینے کی کوشش نہیں کریں گے، جس کے نتیجے میں کسی بے گناہ کو نا کردہ جرم کی سزا بھگتنا پڑے''۔

مجھے جس جگہ رکھا گیا، وہ کوئی روایتی لاک اپ یا جیل نہیں تھی، یہ ایک سیاسی شخصیت کا معاملہ تھا، کیس میں اقدام قتل کا پہلو موجود

تھا' پولیس اور دوسرے متعلقہ ادارے اسی حوالے سے تحقیقات کر رہے تھے' مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میرا کیس کسی روایتی عدالت میں پیش نہیں کیا جائیگا' میری کل کائنات تقریباً پندرہ منٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا ایک کمرہ تھا' مجھے یوں محسوس ہونے لگا' جیسے میں کسی قبر میں آ گیا ہوں' فرق صرف یہ تھا کہ مردے کا کفن سفید ہوتا ہے اور میری قبر سفید تھی' دیواریں اور بستر کی چادر سفید' صاف اور بے داغ تھیں۔ باہر کی دنیا کے ساتھ میرا رابطہ مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا' الیکٹرانک میڈیا جتنی ترقی کر چکا ہے' اس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ پاکستان میں میرے ماں باپ' بہن بھائیوں تک میری اسیری کی اطلاع پہنچ چکی ہو گی۔ امی کا تو رو کے برا حال ہوگا' مصیبت یہ تھی کہ میں اپنی خیریت کی کوئی اطلاع بھی ان تک نہیں پہنچا سکتا تھا' کوئی شخص مجھ سے ملنے بھی نہیں آ سکتا تھا' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آزاد فضا میں اپنی مرضی سے حرکت کرنے کی آزادی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے' کسی شخص سے مخاطب ہونا' کسی کی آواز سن لینا' کتنی بڑی عیاشی ہے۔ مجھے یاد آیا' میرے نانا جان ہسپتال میں داخل تھے' ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا' جس کے نتیجے میں ان کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا تھا' ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ شام کے وقت انہیں ہسپتال کے گراؤنڈ میں لے جایا جائے' میں اس وقت حیران ہوتا تھا کہ یہ اپنے بیڈ پر آرام سے لیٹے ہوئے ہیں' تو یہ پھر باہر کیوں جانا چاہتے ہیں؟ اب اس وقت میری بھی صرف اتنی سی خواہش تھی کہ میرے صیاد اس قفس کا دروازہ کھول کے ذرا سی دیر کیلئے ہی سہی' کم از کم مجھے کھلے آسمان کو دیکھنے کا موقع تو دیں' قید کے دوران انسان کی نفسیات بھی عجیب و غریب ہو جاتی ہیں' میں اپنے ماضی کو یاد کرنے کی کوشش کرتا تو چند ایک خوشگوار یادیں ہی تازہ ہوتی تھیں' لطف یہ تھا کہ ناخوشگوار یادیں بھی محدود ہی تھیں' باقی سب کچھ بیتے ہوئے سمے کی دھند میں گم ہو چکا تھا' میں عذرا کے بارے میں سوچتا' تو وہ مجھے ہوٹل کے کسی کمرے میں چادریں تبدیل کرتی ہوئی یا سینک کے پاس کھڑی ڈھیر سارے برتن دھوتی نظر آتی' لیکن میں ایک ہی منظر کو کتنی مرتبہ سوچ سکتا تھا' میں نے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے کی کوشش کی' تو خیال آیا' دنیا کی بے ثباتی پر وہ شخص غور کرے' جو دنیا میں ہو' میں تو دنیا میں تھا ہی نہیں' وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا' مجھے صرف ایک مرتبہ پوچھ گچھ کیلئے اس کمرے سے' ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا تھا' اس کے بعد میں جانے کتنی مرتبہ یہاں سو چکا تھا' پھر بیدار ہو کے دوبارہ سو چکا تھا۔

فارغ انسان کا ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے' خیال ایک ایسی چیز ہے جس کے آگے آپ کوئی بند نہیں باندھ سکتے' مجھے خیال آیا' بالفرض اگر مجھ پر فرد جرم عائد کر بھی دی جائے' تو مجھے قتل کی بجائے اقدام قتل کا مجرم قرار دیا جائیگا' جس کی سزا چند برس کی قید ہو گی' اب یہ لوگ مجھے پھانسی تو نہیں دے سکتے' قانون کا طالبعلم ہونے کی وجہ سے مجھے یہ علم تھا' امریکی قانون میں چند گنے چنے جرائم کے ارتکاب پر ہی سزائے موت دی جاتی ہے' خوش قسمتی سے اقدام قتل ان جرائم کی فہرست میں شامل نہیں تھا' یہ تصور بھی میرے لیے روح فرسا تھا کہ مجھے کئی سال جیل میں گزارنے ہونگے۔ میری قید کے دوران اگر خدانخواستہ میرے والدین کو کچھ ہو گیا؟ اس سے آگے مجھ سے سوچا نہیں گیا' میں

صرف دل ہی دل میں خدا سے دعا کر سکتا تھا' مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اگر میں نے یہاں نماز ادا کرنے کی کوشش کی' تو یہ لوگ مجھے شدت پسند نہ سمجھ لیں' اس وقت مجھ پر روشن ہوا کہ امریکہ کی تمام تر معاشرتی آزادی ''محدود آزادی'' ہے' اور مجھ جیسے ایک عام سے مسلمان کا ایمان کتنا کمزور ہے' کبھی کبھی میں اس گھڑی کو کوستا تھا' جب میں نے امریکہ آنے کا فیصلہ کیا تھا' اس وقت بھی میں سویا ہوا تھا' جب پولیس اہلکار نے ہلا کر مجھے اٹھایا اور اطلاع دی' تمہارا وکیل تم سے ملنے آیا ہے'' ''میرا وکیل'' میں نے حیرانگی سے دہرایا' اہلکار نے میری حیرانی پر توجہ نہیں دی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا' وہ مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں آیا' وہاں ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا' اپنے لباس سے وہ کوئی آسودہ حال وکیل محسوس ہو رہا تھا' اس کے آگے ایک فائل رکھی تھی' اس نے اپنی نشست سے تھوڑا سا اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کیا'' ''میں ڈینس اوگاندرے ہوں' ایوان نمائندگان کے رکن رالف لوئیس کا لیگل ایڈوائزر' وہی رالف جس کی گاڑی کو تم نے ہٹ کیا تھا' میرے لیے یہ بڑی اچنبھے کی بات تھی کہ رالف کا لیگل ایڈوائزر مجھے ملنے آیا تھا'' ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تم بھی قانون کے طالبعلم ہو' اس نے فائل کھولتے ہوئے کہا' میں جواب میں کچھ نہیں بولا' ''تم پر مختلف اقسام کے الزامات عائد کیے گئے ہیں' جن کے نتیجے میں تمہیں طویل قید ہو سکتی ہے'' ''میں اس کی آمد کے بارے میں اب بھی کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا'' ''مسٹر رالف کی گاڑی کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا' وہی میرے ساتھ بھی پیش آیا ہے' حسن اتفاق سے وہ اپنی گاڑی میں موجود نہیں تھے مگر میں تو اپنی گاڑی میں تھا' اور اب مجھے ہی مجرم سمجھا جا رہا ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا بڑے طویل وقت کے بعد کوئی مجھ سے مخاطب ہوا تھا'' ''مجھے اس کہانی سے صرف اپنے پروفیشن کی حد تک دلچسپی ہے'' اس نے بھی خشک لہجے میں کہا' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا'' ''تمہاری واقف کار ایک امریکی خاتون' معزز رکن سے ملی تھیں اور انہوں نے یہ درخواست کی کہ انسانی ہمدردی کے تحت اس واقعہ اور حادثہ کا جائزہ لیا جائے'' میرے ذہن میں فوراً جولیا کی تصویر ابھری' اس طرح کی صورتحال میں کوئی ''غیر مسلم امریکی'' ہی میری مدد کر سکتا تھا'' ''پھر معزز رکن نے اس بارے میں کیا فیصلہ کیا؟'' میں نے دریافت کیا' تو اس نے بتایا' معزز رکن نے مقدمے کی پیچیدگی' رائے عامہ' میڈیا وغیرہ جیسے مختلف پہلوؤں کی طرف اس خاتون کی توجہ دلائی' کافی بحث و تمحیص کے بعد اس نوجوان خاتون نے یہ تجویز پیش کی' اس حادثے کو تمہارا غیر ارادی فعل قرار دے کر اور تمہیں مشکوک کردار کا حامل قرار دے کر امریکہ بدر کر دیا جائے' تم ان کاغذات پر دستخط کر دو' دو تین دن میں قانون کے بنیادی تقاضے پورے کر کے تمہیں ڈی پورٹ کر دیا جائیگا''

میرے لیے یہ اطلاع کسی مژدہ جانفزا سے کم نہیں تھی' میں نے فوراً ان کاغذات پر دستخط کر دیئے' اوگاندرے اٹھ کر جانے لگا' تو میں نے اسے روکا'' ''کیا یہ ممکن ہے' میں یہاں سے جانے سے پہلے اپنی اس مہربان سے ملاقات کر لوں؟'' اوگاندرے نے وعدہ کیا' وہ اس کی پوری کوشش کرے گا' مجھے یقین تھا' جولیا بھی مجھ سے ملنے کی پوری کوشش کرے گی' لیکن عذرا سے ملے بغیر میں کیسے واپس جا سکوں گا' اور وہ بھی اسے نیویارک کی بے رحم زندگی میں چھوڑ کر' باقی چیزوں کی طرح یہاں سٹریٹ کرائمز بھی بہت ہوتے ہیں' عنقریب اپنی رہائی کا امکان

سامنے آنے کے بعد' میری ذہنی کیفیت تبدیل ہوگئی' اب مجھے پھر دنیا کی طرف لوٹنا تھا' جہاں سود وزیاں کے تمام گوشوارے پھر سے کھل جانے تھے' امید کی کرن چمکی تو بعض ایسی یادیں بھی تازہ ہوئیں' جو لاشعور میں کہیں چھپی ہوئی تھیں' اسامہ کی موت پر کنٹین میں ہونے والا مکالمہ' جولیا سے میری شناسائی کا سبب بنا تھا' اس کے بعد وہ کتنی ہی مرتبہ میرے کام آئی تھی' ڈورتھی سے میرا باقاعدہ تعارف اس نے کروایا تھا' عذرا سے ملاقات کیلئے اس نے مجھے سہارا دیا تھا' پہلے اس نے مجھے میری ذات کے خول سے نکالنے کی کوشش کی تھی' اور اب مجھے اس قید سے رہائی دلوانے کیلئے دوڑ دھوپ کر رہی تھی۔

میرے پاس گھڑی بھی نہیں تھی اور شب و روز بھی نہیں بدلے تھے' اس لیے مجھے وقت گزرنے کا صحیح علم نہیں ہوسکا' اوگاندرے سے ملاقات کے شاید پانچویں دن مجھے دوبارہ میرے کمرے سے نکال کر ایک دوسرے کمرے میں لایا گیا' وہاں سادہ لباس میں تین افراد موجود تھے' ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کر کے سپاٹ لہجے میں کہا ''مسٹر رضا' تمہیں امریکہ کی ریاستی سلامتی سے متعلق بعض ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے امریکہ سے ڈی پورٹ کیا جارہا ہے'' اپنے لہجے اور تیور سے وہ بقیہ دو کا افسر محسوس ہورہا تھا ''اب سے چھ گھنٹے بعد تمہاری فلائٹ ہے' ہمارے اہلکار تمہیں ایئر پورٹ پہنچادیں گے' اور جہاز کی روانگی تک تمہاری نگرانی کریں گے''۔ خدا کا شکر تھا کہ مجھے اس جہنم سے نجات ملنے لگی تھی' ''میری سفری دستاویزات کا کیا ہوگا؟'' میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا ''تمہارے کمرے کی تلاشی کے دوران تمہاری دستاویزات پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں وہ ایئر پورٹ پر تمہارے حوالے کردی جائیں گی'' اس نے کچھ کاغذ میرے آگے کیے اور مجھے ان پر دستخط کرنے کی ہدایت کی' میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا'' ''ایئر پورٹ کی عمارت میں موجودگی کے دوران تم سر پر ہیٹ لے کر رکھو گے اور آنکھوں پر چشمہ لگائے رکھو گے تاکہ تمہاری شناخت نہ ہوسکے'' اس نے اٹھتے ہوئے مجھے آخری ہدایت دی اور کمرے سے باہر نکل گیا' باقی دو افراد میں سے ایک نے ایک لمبی سی ٹوپی میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھے وہ ٹوپی اپنے چہرے پر لینے کیلئے کہا' میں نے ایسا ہی کیا' ان میں سے ایک میرا بازو پکڑ کر مجھے گاڑی تک لے کر آیا' ان چند لمحوں کے دوران مجھے عملی تجربہ ہوگیا کہ بینائی قدرت کا کتنا عظیم عطیہ ہے اور جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں' ان کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا' گاڑی میں بیٹھ جانے کے باوجود انہوں نے مجھے ٹوپی اتارنے کیلئے نہیں کہا تھا' تقریباً دس منٹ کے سفر کے بعد گاڑی کی رفتار آہستہ ہوتی محسوس ہوئی' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے چہرے سے ماسک نما ٹوپی اتارنے کی اجازت دی' میں نے وہ اتاردی' ہماری گاڑی کسی پٹرول پمپ پر رکی تھی' میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص نیچے اترا' اور اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا' ہماری گاڑی کے سائیڈ کے شیشے سیاہ تھے' ان سے باہر نہیں دیکھا جاسکتا تھا' صرف سامنے ونڈ سکرین سے پار نظر آتا تھا' میرے ساتھ بیٹھا ہوا شخص جس سمت سے اتر کے آگے گیا تھا' ذرا سی دیر کے بعد اسی طرف کا دروازہ کھلا' میں نے اس طرف دیکھا تیزی سے اندر آکر میرے ساتھ بیٹھنے والی ہستی جولیا تھی' میری ہمدرد' میری

مہربان‘ اس نے بیٹھنے کے فوراً بعد دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گاڑی چل پڑی‘ اسے دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں‘ اس کی آنکھوں میں بھی نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی‘ مجھ سے ملاقات یقیناً اس کے علم میں ہوگی لیکن میرے لیے یہ بالکل غیر متوقع تھی ”خدا کا شکر ہے‘ کہ تمہیں رہائی مل گئی“ اس کی خوشی اس کے لہجے سے ظاہر تھی ”یہ سب تمہاری مہربانی ہے“ میں نے احساس ممنونیت سے لبریز آواز میں کہا ”ہمارے پاس وقت بہت کم ہے‘ یہ لوگ ائیر پورٹ سے ذرا پہلے کسی جگہ مجھے اتار دیں گے‘ یہ میرا کانٹیکٹ نمبر ہے‘ اس پر میرا ای میل ایڈریس اور گھر کا پتہ بھی درج ہے“ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا‘ اس کا نمبر میرے موبائل میں محفوظ تھا‘ مگر اب وہ موبائل ہی میرے پاس نہیں رہا تھا‘ مجھے اندازہ تھا کہ آگے بیٹھے ہوئے شخص کے کان ہماری طرف ہی لگے ہوئے ہونگے ”ایک مہربانی اور کرنا‘ عذرا“ میں اسے یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ عذرا کا خیال رکھے‘ اس نے میری بات کاٹ دی ”تم اس کی فکر نہیں کرو‘ وہ ٹھیک ہے“ اس نے مختصر طور پر صرف یہ بتایا‘ ٹیلیویژن پر میری گرفتاری کی خبر سننے کے بعد عذرا یونیورسٹی آکر جولیا سے ملی تھی‘ ”اپنے ملک واپس جا کر تم نے ماضی کی تمام تلخیاں بھلا کر‘ نئے سرے سے زندگی شروع کرنی ہے“ اس نے مجھے نصیحت کی ”تمہاری تعلیم ادھوری رہ گئی اس کا مجھے بہت افسوس ہے‘ لیکن اس کے بغیر چارہ بھی کوئی نہیں تھا“ وہ افسوس کا اظہار کر رہی تھی‘ لیکن اگر مجھے سزا ہو جاتی‘ تو پھر بھی میرا تعلیمی کیریئر ختم ہی ہو جانا تھا‘ یہ تو شکر کا مقام تھا کہ میں اپنے دیس‘ اپنے ماں باپ‘ بہن بھائیوں کے پاس جا رہا تھا‘ جہاں میں کسی خوف کے بغیر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لے سکتا تھا‘ تہذیبوں کے ٹکراؤ کا فلسفہ اور نظریہ امریکی مفکرین اور دانشوروں کا دردِ سر ہے‘ مذہب اور سیکولرازم کی جنگ میں مذہب کو پیچھے دھکیلنا اہلِ مغرب کا مسئلہ ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب اور مذہب کی جنگ ہوتی ہے‘ مسلمان ہی مسلمانوں پر خودکش حملے کرتے ہیں‘ اپنی ہی عبادت گاہوں پر گولیوں کی بارش کرتے ہیں‘ ہمارے یہاں کے مسائل ذاتی ترجیحات کا تصادم اور سب سے بڑھ کر نگاہوں کا تصادم ہیں۔ ہمارا بھلا تہذیبوں کے تصادم اور اس کے نتائج سے کیا واسطہ؟

ائیر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے جولیا سے پوچھا تھا کہ اس نے میرے لیے اتنا سب کچھ کیوں کیا؟ جبکہ میرا ملک‘ میرا مذہب‘ میری تہذیب سب کچھ اس سے الگ ہے‘ مختلف ہے‘ مجھے آج بھی اس کے جواب کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا ”تم تہذیبوں کے ٹکراؤ کے نظریہ کے حامی ہو ناں؟ مشرقی اور مغربی‘ اسلامی اور غیر اسلامی‘ مذہبی اور سیکولر تہذیبوں کے ٹکراؤ کا فلسفہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن دنیا میں دو طرح کی تہذیبیں ہیں‘ مردوں کی تہذیب اور عورتوں کی تہذیب‘ دنیا میں ساری لڑائیوں اور خرابیوں کے پس پشت ہمیشہ مرد کھڑا نظر آئے گا‘ اگرچہ جتنا لٹریچر لکھا جاتا ہے اس میں خرابی کی جڑ ہمیشہ عورت نظر آتی ہے لیکن وہ سب لکھنے والے بھی تو مرد ہیں‘ مردوں کی تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ ان کا ایک گروہ خود کو دنیا کی فلم کا ہیرو سمجھ کر اپنے نظریاتی مخالفین کو ولن قرار دے دیتا ہے اور پھر ولن کی سرکوبی کے لئے میدان میں اتر آتا ہے۔ اس میں ہر رنگ‘ ہر نسل اور ہر مذہب کے افراد شامل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے‘ شیکسپیئر کے بقول

زندگی کی اسٹیج پر ہم سب صرف مختلف کردار ہیں' ان میں کوئی ہیرو' کوئی ولن نہیں ہے' خیر چھوڑو ان سب باتوں کو' میرا اور تمہارا رشتہ انسانیت کا ہے' جو مذہب' تہذیب' رنگ و نسل سے ماوراء ہے اور میں نے اسی تعلق کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا ہے اور ہاں اس کی ایک اور وجہ بھی ہے' تمہاری سچی محبت کا احترام بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے"۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی: "اسامہ کی موت تو نجانے انسانیت کی فتح تھی' یا نہیں تھی' لیکن تمہاری اپنے وطن واپسی یقیناً انسانیت کی فتح ہے"۔

ائیر پورٹ سے کچھ پہلے جولیا مجھ سے رخصت ہوگئی' عذرا ایک مرتبہ پھر مجھ سے جدا ہوگئی تھی' لیکن اس کی یادیں' اس کی باتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی' زندگی اسی کا نام ہے' کوئی مل جاتا ہے' کوئی جدا ہو جاتا ہے' لیکن انسانیت اور بنیادی اخلاقی اقدار ہمیشہ برقرار رہتی ہیں اور ان کی پاسداری ہم سب کا فرض ہے۔

یہ ہیں جو میرے زخم ہیں' یہ ہیں جو میرے خواب ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں' برسرِ عام رکھ دیا

ختم شد

عظیم اسلامی شخصیات

"عظیم اسلامی شخصیات" تحقیقاتی کتاب ہے ایسی عظیم اسلامی شخصیات پر جنھوں نے اسلامی تاریخ میں کوئی نہ کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان میں مفسرین، محدثین، فقہاء، امام، علماء، شوریٰ، مصلحین، مورخین، جغرافیہ دان، سیاح، سائنسدان، فلاسفر، متکلمین، سلاطین، فاتحین، مجاہدین اور سیاستدان شامل ہیں۔ امید ہے آپ کو کتاب گھر کی یہ کاوش پسند آئے گی۔

"عظیم اسلامی شخصیات" کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے اسلامی ہسٹری سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔